آسیہ رئیس خان

روا و روشن

وہ دنیا کا انوکھا انسان تھا جو نو برس بعد اپنے ملک، اپنے شہر لوٹنے کے باوجود ایئرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا وقت کو آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے گھر پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ ایک لمبی جدائی کے بعد اپنوں سے ملنے کی بے تابی، خوشی، جوش، جیسے سارے احساسات منجمد تھے یا کسی انجانے ڈر نے انہیں سرد کر رکھا تھا۔ اس کے اندر بس ایک خوف تھا اور کوفت تھی۔

کاؤنٹر سے تیسری کافی لے کر واپس میز پر آیا تو فون کی مخصوص آواز پر اس کا دل لحہ بھر کو بند ہوا۔ اس شہر میں پہلی دفعہ اس کا فون گنگنایا تھا اس کے ذہن میں خیال لہرایا۔ کیا پتا یہیں کسی نے اسے یاد کیا ہو۔ اس نے فون کی اسکرین روشن کی۔ کسی پیغام کے بجائے وہ اشارہ دفتر سے موصول ہوئے ای میل کا تھا۔ فون واپس رکھتے ہوئے وہ رک گیا۔ خود کو روکتے روکتے بھی وہ ایک بار پھر، وہ چند الفاظ پڑھ رہا تھا جنہیں دہرانے کے لیے دیکھنا ضروری نہیں رہا تھا۔

”شاید تمہیں یاد ہو تم نے کہا تھا، میں تم سے کچھ بھی منوا سکتی ہوں۔ تو ایک بار آجاؤ، بڑے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

امی اور ثاقب بھائی اسے بلا بلا کر اور سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ وہ ضد اور غصہ ختم کر کے ہمیشہ کے لیے نہ سہی، کم سے کم ایک بار تو باپ سے ملنے آجائے۔

اور رہی اس کی بات تو یہ منوانے والا خیال تو نو سالوں سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف تھا۔

مانا کہ اس کی اپنی ضد اور باپ سے ٹھنی سرد جنگ نو برس بعد بھی جاری تھی لیکن اب، اس رن میں وہ ولولہ نہیں رہا تھا جو نو سال پہلے ہوا کرتا تھا۔

وہ خود بھی اب نو برس قبل جیسا سر پھرا نہیں رہا تھا البتہ تب سے اب تک ویسا ہی تھا وہ اس کا دل تھا اور اس میں بیٹھا ڈر کہ اسے اس کی ماننا پڑے گی۔

اس نے فون بند کر کے سیاہ کافی کو دیکھا جس کی تلخی اس کے اندر گھلی تلخیوں سے بہت کم تھی۔ وہ سب سوئے ملنے اور وہ نہیں چاہتا تھا اتنے وقت بعد وہ اپنی آمد سے سب کی نیند خراب کرے۔ وہ ایک تھکن کی وجہ سے پہلے ہی سارے گھر کو بہت تنگ کر چکا تھا۔ اس نے کافی ختم کی اور بیگ گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”آپ سو جائیں بڑی امی! تالا میں لگا دوں گی۔“ وہ نزلہ زکام سے تنگ تھیں۔ دوا کھانے کے بعد ان کی نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں اس سے چھپی نہیں تھیں۔

”ارے تمہارے بڑے ابا سونے دیں گے مجھے۔“ انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”جب تک سن نہ لیں۔ گیٹ کو تالا لگا دیا ہے، نہ خود سوتے ہیں نہ مجھے سونے دیتے ہیں۔“

جب بھی رات میں ثاقب بھائی گھر نہ ہوتے، بڑے ابا کو گیٹ مقفل کرنے کی ایسی ہی فکر ہوتی تھی۔

”آپ چلیں، میں آکر ان سے کہہ دیتی ہوں۔“ اس نے آخری رکابی کھنگال کر رکھا۔

"ہاں کہہ دو ذرا، تمھاری بات سمجھ میں آجاتی ہے انہیں۔" وہ کرسی چھوڑ کر کمرے کی طرف چل پڑیں۔

روزانہ مغرب کے بعد ڈیری والا دودھ دے جاتا تھا۔ آج اس نے فون کیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا۔ اسی کے انتظار میں اب تک گیٹ کھلا تھا۔ ورنہ رات کا کھانا ہوتے ہی، بڑی امی گیٹ مقفل کر کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ اس نے گیلے ہاتھ خشک کیے، ایپرن اتارا اور بڑے ابا کے کمرے میں آئی۔

"بڑے ابا! بڑی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے آج لاک میں لگا دوں گی، بس دودھ والا آجائے۔" اس نے دروازے میں رک کر کہا۔

"اسے فون کرو، اگر دس منٹ میں آتا ہے تو ٹھیک ورنہ کہو۔ صبح دے جائے اور لاک لگا دو۔"

ان کے لیے زیادہ چلنا پھرنا تو کافی دنوں سے آسان نہیں رہا تھا۔ ایک بار بستر پر آجاتے تو ان سب کی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں پھر کمرے سے نکلنا نہ پڑے۔ ہال سے گزر کر پورچ کے چند زینے اترنا چڑھنا اور صحن عبور کر کے گیٹ تک جانا پھر واپس آنا، ان کے لیے خاصی مشقت تھی جو پچھلے مہینے سے مکمل بند ہو گئی تھی۔

"جی۔" وہ ان کی بات مان کر پلٹ گئی۔ باورچی خانے کی بتی بجھائی اور فون لیے باہر آئی۔ اسے امی کو بھی فون کرنا تھا۔

"پہلے گڈو سے بات کرلوں پھر امی کو لگاتی ہوں۔" اس نے سوچتے ہوئے دودھ پہنچانے والے بچے کو فون لگایا۔

دوسری سمت رنگ ہوتی رہی کسی نے اٹھایا نہیں۔ "شاید راستے میں ہو۔" وہ وہیں صحن میں ٹہلنے لگی۔

"بھابھی اور بچوں کے بنا کتنا سونا لگ رہا ہے گھر۔"

"بچے اور بھابھی چھٹیاں گزارنے ننھیال میں تھے اور ثاقب بھائی کل ہی انہیں لینے گئے تھے۔ وہ امی کو فون لگا رہی تھی کہ گیٹ کے دوسری طرف آہٹ ابھری۔

"کتنی دیر کر دی تم نے۔"

اس نے گیٹ پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا مگر سامنے موجود، ودیع کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر زمین بوس ہوا اور وہ گونگی ہو گئی۔

وہ جواب تک خود سے قبول کرتے جھجک رہا تھا کہ کس لیے واپس آیا ہے، اس پل ایمان داری سے مان لیا وہ اسی کی خاطر یہاں موجود تھا جو دیر سے آنے کی شکایت کر رہی تھی۔

ان کے درمیان حائل وقت کی دیوار کا سایہ دونوں کے چہروں پر پڑا تھا۔ وہ اب دبلا پتلا، جھنجلایا اور اکھڑ سا لڑکا نہیں تھا بلکہ کچھ بڑھے وزن اور داڑھی مونچھ کے اضافے کے ساتھ وہ ایک سلجھا ہوا، پروقار، ذمہ دار مرد نظر آرہا تھا، چنچل تبسم اور شوخ تاثرات سے خالی طوبیٰ اسے اپنی امی اور چچی کا پرتو لگی، سب کی فکر میں بھاگتی دوڑتی اور وقت پر کام نپٹانے کی فکر میں ڈوبی عورت۔

"جس گھر میں ابا ہوں وہاں کے مکین اور کیسے ہو سکتے ہیں!" ایک کڑوا سا خیال ابھر کر ڈوبنے سے پہلے اسے ملال میں مبتلا کر گیا۔

"اور اسے اس گھر میں قید کرنے والے تم ہو۔"

سنجیدگی کے علاوہ وہ اب بھی ویسی ہی تھی، دبلی پتلی، سیاہ گہری آنکھوں والی سلونی جس نے اس کے اندر ایک نئی دنیا آباد کی تھی۔ طوبیٰ نے یوں سینے سے سانس آزاد کی جیسے وہ پورے نو سال سے اٹکی تھی۔

وہ گھر سے گیا تو متوسط طبقے کا عام حلیے والا لڑکا تھا اور اس وقت جینز، شرٹ، جوتے اور بازو پر رکھا جیکٹ، سب کچھ اتنا بدلا تھا کہ وہ کسی فلم کا امیر کبیر ہیرو لگ رہا تھا۔ ودیع نے جو ایک ہاتھ ٹرالی بیگ پر رکھے تھا، جھک کر فون اٹھایا۔ فون کی اسکرین دو تین آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ تازہ واردات پر منہ بسور رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس نے بیگ کے دستے سے ہاتھ ہٹا کر فون کے اسکرین پر پھیرا جیسے یوں کرتے ہی وہ دراڑیں مٹ جائیں گی اور پھر فون اس طرف بڑھایا۔ تب ہی گڈو کی سائیکل کی گھنٹی بجی۔

"سوری باجی! آج زیادہ ہی لیٹ ہو گیا، مہمان آئے ہیں؟" وہ زمین پر پیر ٹکا کر سائیکل روکے کھڑا حسب عادت بول رہا تھا۔ طوبیٰ نے گیٹ پورا وا کیا اور ودیع کے بازو سے گزر کر گڈو کے قریب آئی۔

"کہاں سے آئے ہیں مہمان؟ میں تو ڈر رہا تھا، آپ نے تالا ہی نہ لگا دیا ہو لیکن پھر سوچا فون نہیں کیا مطلب نہیں لگایا ہوگا۔"

طوبیٰ نے اس کے ہاتھ سے یخ سی تھیلی لی اور پلٹنے لگی کہ اس نے پکارا۔

"باجی! مہمان کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اتنا تو بتا دو۔" وہ اسے گھور کر گیٹ سے اندر آ گئی۔

گڈو بڑبڑاتا ہوا سائیکل آگے بڑھا لے گیا۔

وہ زینے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ودیع وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہاں تک آنا ایک سفر تھا اور گیٹ سے بڑے ابا کے کمرے تک جانا دوسرا۔ وہ واپس آئی اور کچھ کہے بنا ٹرالی بیگ اپنے ساتھ گھسیٹ کر پھر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زینے کے پاس آکر اس نے بیگ اٹھا کر زینہ چڑھنے کے لیے ہینڈل نیچے کیا ہی تھا، پیچھے سے ودیع نے آکر بیگ اٹھا لیا۔ ان کے ہاتھ ٹکرائے تھے۔

وہ تیزی سے بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"بڑے ابا!" وہ دستک دیے بنا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا؟" ان سے پہلے بڑی امی اٹھ بیٹھیں۔

"ابھی تک نہیں آیا گڈو؟" پھر ان کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ "اچھا تالا لگا دیا ہے۔"

وہ واپس لیٹنے لگی تھیں کہ اس کی بات پر تیزی سے کھڑی ہوئیں۔

"باہر وہ، ودیع۔" اس گھر میں یوں اس کا نام ہی کافی تھا۔ بڑی امی کے نہ قدم سنبھل رہے تھے نہ آواز۔ وہ ہائے ودیع، میرا ودیع کہتی، گرتی پڑتی کمرے سے باہر نکلیں۔ سامنے بیٹے کو دیکھتے ہی ان کی آواز اونچی ہو گئی۔ ان کے منہ سے بے ربط سے جملے ادا ہو رہے تھے۔ جتنا انہیں اس کی آمد کا انتظار تھا، اتنا اچانک وہ آ گیا تھا۔ وہ رو رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور اندر بڑے ابا اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کان ہال کی آوازوں پر لگائے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا انہیں پلنگ سے اتار کر، باہر لے جائے یا ودیع کے اندر آنے کا انتظار کرے۔

"وہ اندر آئے گا؟" اس کا یقین ڈگمگا رہا تھا۔

باہر بڑی امی نے اس کی امید کے برعکس کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ خوش تھیں، اسے بار بار گلے لگا کر یقین کر رہی تھیں، اس کا چہرہ تھاما، ہاتھ چومے لیکن ایک بار بھی نہیں کہا "اتنے برس کیوں لگا دیے، اتنے وقت بعد کیوں آئے، میں ترس گئی تھی، مجھے کس بات کی سزا دی۔"

اس کے بن باس نے انہیں محتاط کر دیا تھا۔ کیا پتا پھر کسی بات پر وہ چلا جائے یا پھر ان کے نزدیک وہ سب سوال اور شکوے بے کار تھے کہ وہ، آگیا تھا اور ان کے لیے یہی سب کچھ تھا۔

"آؤ، اپنے ابا سے مل لو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے ان کے کمرے میں لے آئیں۔

ان کے آنے سے پہلے ہی وہ ایک طرف ہو گئی تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ باپ بیٹے دونوں سے کچھ بعید نہ تھا۔

ودیع کے لیے یہ چند قدم، سب سے کٹھن مسافت تھے۔

دروازے سے ان پر نظر پڑتے ہی اس کا دل سکڑ گیا۔ اگر وہ نفرت کرنے کے قابل ہوتا تو اسے دنیا میں اس انسان سے نفرت ہو سکتی تھی لیکن اس وقت کمزور، لاغر اور ہڈیوں کے ڈھانچہ بنے شخص کو دیکھ کر اس کے اندر اداسی اتر گئی تھی۔

اسے ویسی کمینی سی خوشی نہیں ہوئی تھی، جیسی وہ سوچتا تھا کہ ایک دن انہیں اپنے غیر مرئی تخت کے بنا دیکھ کر وہ محسوس کرے گا۔

"السلام علیکم۔" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے پاس پہنچا۔ بڑے ابا نے جواب دیا اور طوبیٰ کو لگا، وہ آج ایک معجزے کی شاہد بنی ہے۔

عجیب سی فضا تھی کمرے کی، نامانوس، بے چین، بے آرام سی۔ کوئی بندہ اپنے کردار میں نظر نہیں

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

آ رہا تھا۔ باپ سے مجبوراً ضرورتاً اتنی بات کرنے والا ودیع پلنگ کے کنارے بیٹھ گیا تھا، اولاد پر حکم چلانے اور ہمیشہ سخت لہجے میں بات کرنے والے بڑے ابا کے جھکے کندھوں سے زیادہ حیران کن، ان کی گدلی دھندلی آنکھیں تھیں، شوہر اور اولاد کے درمیان ہمیشہ دباؤ اور تناؤ میں رہنے والی بڑی امی، اس وقت پرسکون تھیں۔ بس وہ ہی کل کی طرح آج بھی اپنے کردار میں تھی، تماشائی، لیکن نہیں وہ تو آج اس منظر کے پیچھے کی وجہ تھی۔

"سفر ٹھیک تھا؟" بڑے ابا نے پوچھا۔

"جی۔"

"ڈائریکٹ فلائٹ تھی؟"

"نہیں۔" وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔ رسمی اور عام سی گفتگو کی اہمیت اس پر آج واضح ہوئی تھی۔

وہ دبے قدموں باورچی خانے میں چلی آئی۔ دودھ اندر رکھ کے فریج بند کیا ہی تھا کہ امی کی کال آ گئی۔

"امی سے کیا کہوں؟" اسے نئی فکر نے گھیرا۔

"فون کیوں نہیں اٹھا رہیں؟" بڑی امی کی آواز ابھری تو وہ چونکی۔ ان کی بیماری اور نیند اڑ ان چھو ہو گئی تھی۔

"امی ہیں، کیا کہوں؟" اس نے رک رک کر الجھن بیان کی۔

"مجھے دو۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے، تمہارے بھائی جان بھی۔ ذرا رک کے بات ہی سن لو، ہاں تو۔ ودیع آیا ہے، ہاں ہاں ودیع، ابھی کچھ دیر پہلے، ہاں وہی کہنے والی تھی، اسے چھٹی نہ ملے تو تم ہی آ جاؤ، ہاں، اللہ حافظ۔"

انہوں نے فون بند کر کے واپس اسے دیا۔

"ٹوٹ کیسے گیا؟"

"گر گیا تھا۔"

"ودیع کھانا کھائے گا، ہے یا کچھ باہر سے منگوا لیں؟" ان کا جوش اور خوشی اسے اچھی لگ رہی تھی۔

"بڑی امی [illegible] فریزر سے بھی کچھ نکال کر فرائی کر لیتی ہوں۔"

"وہ فریش ہو کر آ رہا ہے تب تک تم کر لو، میں ثاقب اور شہاب کو فون کر لیتی ہوں۔"

"جی۔"

دوبارہ فریج کھولتے ہوئے، اسے بھی بڑی امی کی طرح خیال نہیں آیا کہ وہ فریش ہونے کدھر گیا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی ودیع کو احساس ہوا کہ اس کا کمرہ اب کسی اور کے زیر استعمال ہے۔

"ایکسائٹمنٹ میں امی کو خیال نہیں رہا شاید۔" بیگ گھسیٹتا وہ آگے آیا۔

پہلا مرحلہ اس کی توقع سے زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔ جسے سوچ کر سارا وقت اس کے اعصاب تشنج زدہ تھے، اس پڑاؤ کے پار ہو جانے پر وہ اب سکون کی حالت میں تھے۔

یہاں آنے کے فیصلے کے بعد سے اس پر حاوی اعصاب شکن سوچیں بھی سست ہو کر کہیں گردن ڈالے اونگھ رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر سکون تھا۔

وہ اب تک خود کو یقین دلاتا آیا تھا کہ اس گھر سے دور جانا، یہاں کی غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکنا، یہاں کے اصولوں اور 'جیلر' سے بچ پانا اس کی خوش قسمتی تھی، وہ ہمیشہ خود کو شاباشی دیتا تھا کہ بڑے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں وہ خود کو باپ کے سائے سے دور کر پایا تھا، لیکن اس وقت اس کے اندر اتر رہا ہر احساس اسے باور کرا رہا تھا کہ اس نے ہمیشہ اس گھر، اس جگہ اور یہاں کے لوگوں کو بے انتہا یاد کیا تھا۔ نو سال قبل وہ جس اطمینان کی خاطر یہاں سے گیا تھا وہ اطمینان اسے یہاں آ کر ہی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا۔ سلوٹ سے پاک ست رنگی چادر سے ہوتی، اس کی نظر تکیے کے ساتھ رکھی کتاب پر پڑی۔ وہ گلزار کی نظموں کی کتاب تھی۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا اور وہاں طوبیٰ شیخ لکھا دیکھ کر ٹھٹک کے کمرے پر نظر دوڑائی۔ پردے پر لٹک رہے کیچر، آرائشی میز پر

رکھے لوشن، کریم، لپ اسٹک، اسکرنچیز اور دروازے کے پیچھے لگے ہینگر میں جھولتے دوپٹے اور عبایا۔

اس نے مڑ کر کھلی کتاب میں ایک بار پھر نام کو دیکھا اور درمیان سے کتاب کھولی جہاں پینسل رکھی تھی۔ صفحے پر 'عادتاً ہی' عنوان سے نظم تھی۔

سانس لینا بھی کیسی عادت ہے
جیے جانا بھی کیا روایت ہے
کوئی آہٹ نہیں بدن میں کہیں
کوئی سایہ نہیں ہے آنکھوں میں
پاؤں بے حس ہیں، چلتے جاتے ہیں
اک سفر ہے جو بہتا رہتا ہے
کتنے برسوں سے، کتنی صدیوں سے
سانس لیتے ہیں، جیتے رہتے ہیں
عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔

الفاظ سیدھے دل پہ جا کے لگے تھے۔ اس نے آہستہ سے کتاب بند کر دی۔ کچھ دیر وہ کشمکش و بیچ میں رہا کہ کسی اور کمرے میں جائے یا یہیں رکا رہے۔ اب تو اسے باقی کمروں کے مکینوں کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ طلال رہتا تھا اور وہ جانتا تھا طلال اب یہاں نہیں ہے۔ گھر میں کمروں کے مکینوں کے علاوہ بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ تر و تازہ ہو کر باہر آیا تو بڑی امی خاندان بھر میں، اس کے آنے کی خبر سنانے میں مشغول تھیں۔ اسے دیکھ کر جلدی جلدی بات سمیٹی اور اسے لے کر باورچی خانے میں آ گئیں۔ طوبیٰ کباب تل رہی تھی۔ دونوں نے کرسیاں سنبھالیں اور اس نے کھانا چن دیا۔

اسے یاد تھا اس نے گھر چھوڑا اس وقت یہاں فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا، چپ چاپ اور بنا آواز کیے کہ دسترخوان پر ابا بھی موجود ہوتے تھے۔

"وہاں کون بناتا ہے کھانا؟" بڑی امی نے مشرقی ماؤں کی پہلی پریشانی کو آواز دی۔

"خود ہی بناتا ہوں۔" وہ سارے لوازمات میز پر رکھ کر باہر آ گئی۔ احتیاط سے بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔

"کیا آج نیند کی گولی اثر کرے گی؟" اس نے اسی احتیاط سے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

وہ فون دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی۔ خولہ بھابھی اور طلال کے پیغام تھے۔ اس نے بنا دیکھے ہی فون بند کر دیا۔ ودیع کے آنے کا سننے کے بعد کیا بات ہو سکتی تھی، اسے اندازہ تھا اور اسی لیے اسے میسج پڑھنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ فون آرائشی میز پر رکھتے ہوئے اسے آئینے میں وہی گرے ٹرالی بیگ نظر آیا اور وہ یوں جھٹکے سے پیچھے مڑی گویا بیگ کی جگہ ودیع کھڑا ہو۔

"یہ ودیع کا کمرہ ہے۔ تھا۔" اس نے تیزی سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور سکون کا سانس بھرا۔ اس کی سلیقہ مندی نے شرمندگی سے بچا لیا تھا۔

وہ بیگ کے پاس آئی، جس پر پلاسٹک کی تھیلی میں ودیع کے اتارے ہوئے کپڑے سلیقے سے تہ کر کے رکھے تھے اور ہینڈل پر تولیہ پھیلا تھا۔

"بڑی امی شاید بتانا بھول گئیں انہیں۔"

اب تو اوپر ایک منزل کا اضافہ ہو گیا تھا جہاں خولہ بھابھی اور ان کے بچوں کے کمرے تھے۔ جب تک طلال یہاں تھا، وہ اور امی ایک کمرے میں تھیں۔ طلال کے جانے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ آہستگی سے پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔

اسے ایک دم یاد آیا اور وہ فون دیکھنے لگی۔ نو سال تک وہ اس سے رابطہ کرنے کا حوصلہ جمع نہیں کر پائی تھی لیکن اب بڑے ابا کی زوال پذیر صحت نے اس میں وہ ہمت بھر دی تھی۔

اسے امید نہیں تھی کہ ودیع اب بھی یہ فون نمبر استعمال کر رہا ہو گا۔ وہ بس اپنی قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ پہلی اور آخری بار کچھ کرنا چاہتی تھی۔ سارے خوف اور اندیشوں کے ساتھ وہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کے بعد والی صورت حال، آر یا پار کی ہو گی جس میں وہ سب کچھ ہار بھی سکتی تھی۔ اس نے چیٹ کھول کر وہاں

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

موجود اکلوتا پیغام دیکھا جس پر بلیو ٹک بھی نہیں تھی۔

"تم میرے میسج کی وجہ سے آئے ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔۔۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تم نے میرا میسج دیکھا پڑھا بھی ہے یا نہیں، یہ نمبر تمہارے پاس ہی ہے یا کسی نئے مالک کو یہ میسج گیا ہے۔ کیا یہ اتفاق ہے میں نے میسج کیا اور کچھ دن بعد تم آ گئے۔؟" اس نے فون سے نگاہ ہٹا کر اس کے بیگ پر مرکوز کی۔

"تم واقعی اس گھر میں موجود ہو۔" وہ اس حقیقت پر خوش ہونا چاہتی تھی لیکن اب دل سہما تھا۔ کیا پتہ نو سال پہلے جس زنجیر سے بڑے ابا نے اسے اس گھر سے باندھا تھا وہ اسے یہیں اتار پھینکنے آیا ہو۔

اس نے انگلی میں موجود اس انگوٹھی کو دیکھا جو بڑی امی نے نکاح کے بعد، کنگن کے ساتھ اسے پہنائی تھی۔ کنگن تو اس نے اگلے دن ہی اتار دیے تھے مگر انگوٹھی، نو سال سے اس کی انگلی میں موجود تھی۔

فون سے ابھری آواز پر وہ ادھر متوجہ ہوئی۔ امی نے صوتی پیغام بھیجا تھا۔ وہ کل صبح ہی بس سے نکل رہی تھیں۔ ان کی آواز کی کھنک اور جوش پر وہ اور اداس ہو گئی۔

"یا اللہ میری امی کو اب کوئی دکھ نہ دینا!" اس نے تڑپ کے دعا کی۔ نو سال سے ان کی جان بھی تو سولی پر تھی۔

بہت دیر بعد جب اسے خیال آیا کہ کھانا ہو گیا ہو گا تو وہ باہر نکلی۔ بڑی امی اور وہ وہیں بیٹھے بات کر رہے تھے۔ وہ اس نازک موقعے پر بے تحاشا مسرت کے باوجود اس بات کا خاص خیال رکھ رہی تھیں کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکلے جو پھر اسے ان سے دور کر دے۔

ان کی ساری عمر ہی احتیاط برتتے گزری تھی۔ شوہر کا مزاج تو تھا ہی کڑوا، بچے بھی جو باپ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ سب ماں کو سناتے تھے اور ان کی ہمیشہ ایک ہی کوشش ہوتی، کسی طرح بچوں کو یقین دلا سکیں کہ ان کے ابا یہ سب ان کی بھلائی کے لیے کرتے۔ ساری سختیاں اور پابندیاں ان کے بہتر مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے عائد کی گئی ہیں۔ ان کی ممتا کا مقابلہ ہمیشہ وفادار بیوی سے رہا تھا۔ انہیں نہ شوہر غلط لگتا تھا نہ بچے لیکن ان کا اختیار، بس بچوں پر چلتا تھا۔ اب بھی لاشعوری طور پر اس کا دل نرم کرتے وہ شوہر کا بدلا مزاج اور ان کی بیماری اسے سنا رہی تھیں۔

"اس بار گئے تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا گھر میں ہی آکسیجن کا انتظام رکھنا پڑے گا۔"

اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئیں۔

"یہ اٹھا لو طوبیٰ! تم نے ہاتھ بھی نہیں دھوئے۔" وہ بھی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کارنر والا کمرہ ٹھیک کر دیا ہے۔"

وہ ہاتھ دھونے سنک کی طرف گیا تو اس نے برتن سمیٹتے ہوئے دھیمی آواز میں بڑی امی سے کہا۔

"اچھا، آؤ۔" انہوں نے اسے جواب دے کر ودیع کو دیکھا۔

اب ان کی آواز اور چہرے سے تھکان متر شح تھی۔ نیند بھی اب گھیرے تھی لیکن نو سال کے انتظار کے بعد ملنے والی یہ خوشی، سب پر بھاری ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ بھی سو جائیں اب بڑی امی! ورنہ صبح طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔"

اب کے اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ودیع میز کے پاس آیا اور اس نے ادھر جا کر جھوٹے برتن سنک میں رکھے۔ "صبح بات کریں گی امی! آپ آرام کریں، میڈیسن لی آپ نے؟"

"ہاں ہاں لے لی تھی، تم بھی سو جاؤ، اتنے لمبے سفر نے تھکا دیا ہو گا، آؤ۔"

وہ اسے تنہا چھوڑنے تیار نہ تھیں، ساتھ میں لے کر باورچی خانے سے نکلیں۔ انہیں ان کے کمرے کے دروازے تک چھوڑنے کے بعد وہ واپس ہال میں آیا۔ باورچی خانے سے آ رہی آوازیں اس کے اب بھی ادھر ہی ہونے کا اعلان تھیں۔ وہ اس کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

یہیں اس ہال میں اس نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ سب گھر والوں کے ساتھ چچی کے پیچھے کھڑی بیس سال کی طوبیٰ، اس دن باقیوں کے مقابلے میں زیادہ افسردہ اور دکھی تھی۔ ہر کوئی آناً فاناً عقد اور اس کی رخصت پر حیران سا تھا۔ اتنی یکا یک تبدیلیاں اور فیصلوں حیرانی ہر کسی کو تھی لیکن اس نے اسے سب سے چھپ کر اس بری طرح روتے تڑپتے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اس منظر نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ تو جانے سے پہلے اسے کہنا چاہتا تھا کہ ابا کے فیصلے نے کیسے سب الجھا دیا ہے مگر اس کے بعد، اس وضاحت اور صفائی کی ضرورت ہی کہاں رہ گئی تھی۔ وہ بہت ٹوٹ کے گھر سے نکلا تھا۔

"اسے اب بھی اپنے بڑے ابا پر پورا بھروسا ہو گا۔" جانے سے پہلے اس کے اداس چہرے سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے افسردگی سے سوچا تھا۔ اپنے شوق اور خواب کی جو قیمت وہ ادا کر کے جا رہا تھا، اس نے اس سے سب چھین لیا تھا، وہ خالی اور کنگال تھا اور اس سارے خالی پن میں ایک ضد براجمان ہو گئی تھی۔ اسے اپنے سخت مزاج اور ظالم باپ کو سبق سکھانا تھا۔ آہٹ پر وہ خیالوں سے باہر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر صوفے کے پیچھے ہی رک گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر رخ اس کی طرف کیا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" گھر میں محض تین افراد کی موجودگی میں اس کا سوال مناسب تھا۔

"خولہ بھابھی اپنی امی کے یہاں ہیں، ثاقب بھائی انہیں لینے گئے ہیں، شہاب بھائی اب ساتھ نہیں رہتے، طلال کی جاب پونا میں ہے، امی آج کل اس کے پاس ہیں۔"

اس نے ایک سانس میں ساری تفصیل بتا دی۔

"اچھا۔"

اس کے اچھا میں اپنے لیے ہی اچنبھا تھا کہ یہ سب تو وہ جانتا تھا پھر جانے کیوں، اس وقت بھولے بیٹھا تھا۔ اس نے گیٹ مقفل نہیں کیا تھا، وہ اسی کام سے جا رہی تھی کہ ہال میں اسے دیکھ کر رکنا پڑا تھا۔

"مجھے آئیڈیا نہیں تھا، اس لیے امی کے کہنے پر اپنے پرانے روم میں چلا گیا۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہا تھا۔ درمیان کے نو سال تکلف اور اجنبیت بن کے جو کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کے وہ معذرت کرتا طوبیٰ نے درمیان میں ہی اس کی بات منقطع کر دی۔

"ہال کے بعد پہلے روم میں چلے جائیں۔"

وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

ودیع نے وہیں سے اسے گیٹ پر قفل لگاتے دیکھا اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی اپنا بیگ لینے چلا گیا۔

طوبیٰ کے بتائے کمرے میں آ کر اس نے بتی بجھائی اور پلنگ پر گر گیا۔ بے شمار سوچیں تھیں، ساتھ ہی جیٹ لیگ بھی، وہ ساری رات جاگتا رہا۔ آج رات نیند طوبیٰ کو بھی نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

گزشتہ شب ہی بڑی امی سب کو فون کھڑکا چکی تھیں، اس لیے اگلی صبح اس نے خود کو مہمانوں کے لیے تیار کر لیا تھا۔

چوں کہ ثاقب بھائی کا ریزرویشن کل شام کی ٹرین کا تھا، سو وہ سب سے پہلے صبح صبح بھابھی اور بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ تب ودیع سو رہا تھا۔

"اکیلا آیا ہے؟" خولہ بھابھی کے سوال میں چھپا تجسس اسے خوب پتا تھا۔

"جی۔"

"بڑے ابا کیسے ملے اس سے؟"

"نارمل۔"

"نارمل کیا ہوتا ہے؟" انہیں اس کا جواب اچھا نہیں لگا۔ انہیں ہر بات مفصل چاہیے ہوتی تھی پھر یہ تو بڑا خاص موقع تھا، جو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ پانے کا انہیں بڑا افسوس ہو رہا تھا۔

"وہ غصہ نہیں ہوئے نہ کوئی طنز اور شکایتیں کیں، دونوں نے دعا سلام کی اور حال احوال

پوچھا۔
"بس؟" ان کی آواز میں مایوسی تھی۔
"ہوں۔" اس نے پراٹھا توے پر ڈالا اور سرد زہر بھری چادر، اپنے اوپر پڑتے ہی گرم تیل کی چھینٹیں نکل گئیں۔
"بڑی امی نے تو پوچھا ہوگا، اتنے سالوں سے اکیلا ہے یا۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں چپ ہو کے اصل سوال، لفظوں میں ڈھالے بنا ہی پوچھ لیا۔
"مجھے نہیں پتا بھابھی! بڑی امی اور ودیع کی کیا بات ہوئی۔" خولہ بھابھی اکثر ہی اس کی برداشت آزماتی تھیں لیکن آج اسے تحمل اپنانے کے لیے بہت جتن کرنے پڑ رہے تھے۔
"وہ یہیں ہیں، آپ خود ہی ان سے سب پوچھ لیجیے گا۔" اس نے چمٹے سے پکڑ کر پراٹھا پلٹا۔
"میں کیوں پوچھوں؟" وہ بدک کر پیچھے ہوئیں۔ "گھر والوں کو فکر ہونی چاہیے جب انہیں نہیں پڑی تو میں کون؟" وہ یوں ہی سوچ دیکھ کر گھر والی اور پرائی ہوتی رہتی تھیں۔
ایسا نہیں تھا کہ نو سال سے وہ رشتے ناتے توڑ بیٹھا تھا اور اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بات کرتا تھا لیکن خولہ بھابھی کا انداز اور سوال ایسے ہی تھے، گویا اب اس کے آنے پر ہی اس کے بارے میں سب اور سچ معلوم ہوگا۔
سب کے ناشتے ہی چل رہے تھے کہ امی بھی آگئیں۔ ان کے واقعی خوشی کے مارے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ بڑے ابا کا ناشتہ لے کر گئی تو وہ معمول کی طرح اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس نے پہیوں والی میز پر ٹرے رکھی اور انہوں نے اخبار اسے تھما دیا۔ اخبار رکھ کے اس نے میز کے پہیے اس طرح پلنگ کے نیچے کیے کہ ٹرے اب ان کے سامنے تھی۔
"ناشتے سے پہلے والی ٹیبلیٹ لے لی تھی؟" اس نے روز والا سوال دہرایا۔
"ہاں بیٹا! ودیع اٹھا؟" وہ جو تب سے سوچ رہی تھی کس طرح ودیع کی آمد پر ان کے خیالات کا اندازہ لگائے، انہوں نے خود ہی سوال پوچھ کر اسے حیران کر دیا۔
"نہیں۔" جلد ہی سنبھل کر اس نے جواب دیا۔ "ثاقب بھائی، خولہ بھابھی آگئے ہیں اور امی بھی۔" وہ ناشتے کے بعد کی دوائیں نکالنے لگی۔
"آپ باہر چلیں گے کچھ دیر؟" اس نے ابلا انڈا چھیلتے بڑے ابا کو دیکھا۔ ان کے اندر کیا چل رہا ہے، اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔
"ابھی نہیں، طلال بھی آیا ہے؟"
"نہیں، امی کو صبح بس میں بٹھا دیا تھا۔ ویسے اب امی عادی ہو گئی ہیں۔" اس نے دوائیوں کا ڈبہ بند کیا اور مٹھی کی ساری گولیاں ٹرے میں رکھی چھوٹی سی خالی پیالی میں ڈال دیں۔
وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے اور وہ پلنگ پر بکھرا سامان سمیٹنے لگی۔ سارے گھر میں وہ واحد ہستی تھی جسے انہوں نے کبھی ڈانٹا نہیں تھا، جس پر کوئی سختی نہیں کی تھی۔ جانے انہیں اپنی بھتیجی یتیم ہونے کی وجہ سے عزیز تھی یا پھر بیٹی ہونے کی وجہ سے۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا، بیٹی نہیں دی تھی اور ان کی وجہ سے طوبیٰ نے کبھی، اپنے ابا کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ طلال کے ساتھ بھی سخت تھے لیکن اس کے لیے سراپا شفقت اور محبت۔ بچپن میں شہاب بھائی اکثر اس بات پر اس سے لڑائی کرتے تھے۔ انہیں لگتا تھا وہ بس اس کے ساتھ سگی اولاد جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور باقیوں کے ساتھ سوتیلا۔
"بڑے ابا سے پوچھوں، انہیں ودیع کا آنا کیسا لگا؟" اس نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا پھر فوراً ہی اپنا خیال رد کر دیا۔ مانا وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کر لیتی تھی لیکن اتنی ہمت اب بھی نہیں آئی تھی۔
"تم جاؤ، کام ہوگا۔ میں دوائیاں لے لوں گا۔" انہوں نے اسے دیکھا۔
"جی۔" وہ باہر آگئی۔

☆☆☆

ان کا دل اور پھیپھڑے بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ دل کے جانے کون کون سے عارضے انہیں لاحق تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا، جب تک یہ دوا اور علاج کی مدد سے دھڑکنے کے قابل ہے وہ جیتے رہیں گے۔ چند ماہ سے وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کے رہ گئے تھے۔ ذرا سی جسمانی محنت سے وہ نڈھال ہو جاتے تھے، ان کا سانس پھول جاتا تھا۔ اس محنت میں زیادہ چلنا بھی شامل تھا۔ آخری بار جب ثاقب بھائی انہیں اسپتال لے کر گئے تو وہ بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہیں ڈاکٹر کی باتیں سننے کے بعد، اس نے ودیع کو لکھا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ ان کی بیماری میں ودیع کی جدائی کا کتنا ہاتھ ہے۔ اس نے تو اپنی مستقل مزاجی یعنی ضد سے سب کو حیران کر دیا تھا۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ جائے گا تو واپس پلٹ کر دیکھے گا بھی نہیں۔
اس کا آبائی وطن ایک چھوٹا سا دیہات تھا۔ تایا ابا اور ان کا خاندان اب بھی وہیں رہتے تھے۔ دادا پڑھے لکھے نہیں تھے، تایا ابا نے بھی چند جماعتیں پڑھی تھیں۔ دادا کی مختصر سی زمین پر کاشت کاری ایک بھرے پرے خاندان کے لیے ناکافی تھی۔ ان کے بیٹے بھی وہیں چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا جو بی اے کر پایا تھا، شہر میں نوکری کر رہا تھا لیکن اس کے بیوی بچے بھی گاؤں میں ہی ہوتے تھے۔
تایا ابا کے برعکس، بڑے ابا نے شہر آ کر پڑھائی جاری رکھی تھی۔ تعلیم کے حصول میں انہیں اپنے گھر سے کوئی سہارا ملا تھا نہ معاونت بلکہ اس کے لیے انہوں نے بڑی پریشانیاں اور مشکلیں جھیلی تھیں۔ اس میں سب سے زیادہ مشکل، انہیں شہر کے طرز زندگی اور تعلیمی اداروں کے کام کاج سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ اپنے والد کی مرضی اور ناراضی کی پروا کیے بنا، وہ چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ شہر لے آئے تھے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے شادی بھلے والدین کی مرضی سے کی لیکن ان کے حکم اور خواہش کے باوجود، بیوی بچوں کو شہر میں اپنے ساتھ رکھا۔
دادا چاہتے تھے کہ وہ شہر میں نوکری کریں اور بہو اور پوتے ان کے ساتھ، گاؤں میں رہیں مگر وہ بچوں کی تعلیم اور بہتر مستقبل کے لیے کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔
اسی وجہ سے وہ گھر میں سب کے لیے ایک سخت گیر قسم کے سربراہ بن گئے تھے۔ بچوں کو سہولیات ساری دیں لیکن رعایت، مروت ذرا بھی نہیں۔ انہیں اسکول میں پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اسکول کے بعد محلے میں جا کر کھیلنے کا قلیل سا وقت معین تھا۔ جس میں بچے کبھی مطمئن نہیں ہو پاتے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے جاننے کا جو فقدان، ان میں اور ان کے ابا میں تھا وہی ان میں اور ان کے بچوں میں بھی منتقل ہو گیا تھا لیکن ان کی نظریں جس ہدف پر تھیں اس نے دیگر مناظر پر توجہ پڑنے ہی نہیں دی۔
امتحانوں کے بعد اچھے نتائج، انہوں نے بچوں کی زندگی کا یہ ہی ایک مقصد طے کر رکھا تھا۔ وہ خود ہی سب کچھ دیکھتے تھے۔ 'اوپن ڈے' ہوتا یا 'پی ٹی اے' جہاں سب بچے ماؤں کے ساتھ آتے، ان کے ساتھ ہمیشہ بڑے ابا ہوتے۔ بڑی امی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ انگریزی وہ الفابیٹس کی حد تک جانتی تھیں۔ نہ انہوں نے کبھی بچوں کی پڑھائی اور اسکول کے معاملے میں شامل ہونے کی کوشش کی نہ بڑے ابا نے انہیں موقع دیا۔ اسکول کے بعد بھی بچوں کے مضامین کیا ہوں گے، کس میدان وہ اپنی عملی اور پیشہ ورانہ زندگی شروع کریں گے اور اس کے لیے ضروری تعلیمی لیاقت کی تکمیل، کالج کا انتخاب، سارے فیصلے انہوں نے ہی کیے تھے۔
ودیع کو اپنے نمبروں کی بنا پر ممبئی کے کالج میں داخلہ مل رہا تھا لیکن بڑے ابا دونوں بڑوں کی طرح اسے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے اس کے اندر باپ کی سختیوں کا ڈر تھا، ان کا طریقہ کار ناپسند تھا، غصہ بھی آتا تھا لیکن اسے ممبئی جانے نہ دینے پر، اس کے اندر بغاوت پنپنے لگی تھی۔
چھوٹا بھائی چوں کہ ان کے ساتھ ہی رہتا تھا

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

اس لیے اپنے بیٹوں جیسی سختی وہ طلال پر بھی کرتے تھے جو بھائی کی وفات کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہی۔ بس ایک طوبیٰ تھی جسے بچپن سے انہوں نے خاص شفقت سے نوازا تھا۔ وہ سب سے چھوٹی اور گھر کی واحد بیٹی تھی، پھر باپ کی وفات کے بعد تو وہ انہیں اور عزیز ہو گئی۔ اس کے لیے ان کا دل اور رویہ ہمیشہ نرم ہی رہا تھا۔ کچھ وہ بھی مزاجاً ذمہ دار اور تابع دار تھی۔ بڑوں کے ساتھ بڑے ابا کا رویہ دیکھ کر ہی اس نے ان کی پسند والے، سارے کام اپنا لیے تھے، انہیں شکایت کا موقع کبھی نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

بڑے ابا کی سلطنت، ان کی مرضی اور حکم کے مطابق ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ ثاقب بھائی اور شہاب بھائی اچھی نوکری کے بعد شادی شدہ ہو کر باپ بھی بن گئے تھے۔

ان سب کو زندگی میں کامیاب اور مصروف دیکھ کر ہر کوئی، اس کا سہرا بڑے ابا کے سر باندھتا تھا۔ موازنے اور مقابلے کے لیے سب کے پاس گاؤں میں برسوں پہلے جیسے دگرگوں حالات میں ہی جی رہا تایا ابا کا خاندان تھا۔

طلال اور ودیع کی نوکری کے بعد گھر میں ان دونوں کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے کہ تب ہی اچانک ودیع نے شوشا چھوڑا کہ اسے بیرون ملک ملازمت مل گئی ہے اور وہ جا رہا ہے۔ بڑے ابا نے صاف کہہ دیا۔

"کوئی کہیں نہیں جا رہا۔" مگر اس دفعہ گھر میں بغاوت اور حکم عدولی کی فضا قائم ہوئی تھی۔

ودیع باپ کے سامنے ڈٹ گیا کہ وہ تو جائے گا ہی چاہے اسے گھر سے نکال دیا جائے۔ یہ گھر میں آیا پہلا طوفان تھا۔

جہاں در و دیوار نے ہمیشہ، بڑے ابا کی گرج دار آواز ہی سنی تھی، آج وہ بھی ایک توانا ضدی لہجے پر حیران تھے۔ اس کی برداشت اب ختم ہو گئی تھی، اس کے بازو [illegible] تو اسے اب اپنی مرضی کا آسمان چاہیے تھا۔ وہ باپ کی قید اور گھٹن سے [illegible] چاہتا تھا۔

اس نے اپنے تئیں سارے انتظامات کر لیے تھے اب ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کے ہوش اس وقت ٹھکانے آئے جب پاسپورٹ نہیں ملا۔ پہلا ہی شک ابا پر گیا اور اسے یقین نہیں آیا، اس کا باپ ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ ماں ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی بے بس تھیں۔

جب پاسپورٹ کی بازیابی کے لیے وہ ان سے بحث کر رہا تھا تو انہوں نے، اپنے ازلی تحکمانہ اور بے لچک لہجے میں شرط رکھی۔

"پاسپورٹ چاہتے ہو تو جانے سے پہلے طوبیٰ سے نکاح کر لو۔"

☆☆☆

جب وہ سو کر اٹھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر باہر آیا تو اس کا انتظار کرتے کرتے سب نے کھانا کھا لیا تھا۔

ثاقب بھائی اور چچی یعنی طوبیٰ کی امی بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ بچے اجنبی مہمان کی طرح اسے سلام کر کے تہذیب کے دائرے میں کھڑے تھے۔ خولہ بھابھی کی کریدتی، تلاشتی نگاہیں اسے محسوس ہو رہی تھیں۔

"کتنے بڑے ہو گئے ہیں سب!" وہ اپنے قد کے برابر پہنچ چکے عبداللہ اور عبدالرافع کو دیکھ کر حیران تھا۔

"بڑے دن بعد بھی تو دیکھا ہے تم نے۔" چچی کی بات پر وہ سر ہلا کے مسکرا دیا۔

وہ ان سے پڑھائی اور ان کی دلچسپیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"اب تم کھانا بھی کھا لو۔" بڑی امی سے زیادہ دیر صبر نہیں ہوا تو درمیان میں ٹوک دیا۔

"دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر چکا ہے اب تو۔"

"کچھ دن نیند مجھے وہاں کے ٹائم پر ہی آئے گی امی، ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔" اس نے انہیں سمجھایا۔

"پہلے کھا لو پھر باتیں کرنا۔" وہ کھڑی ہوئیں تو وہ بھی اٹھ گیا۔

"خولہ! اسے کھانا دے دو۔" وہیں بیٹھی بہو سے کہتی اسے لیے باورچی خانے میں آ گئیں۔

کچھ دیر بعد خولہ تو نہیں طوبیٰ اندر آئی۔ خولہ نے اسے بھیجا تھا کہ بڑی امی تمہیں بلا رہی ہیں اور ان دونوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی۔ خولہ ایسی ہی تھیں۔

"سو گئے؟" اسے دیکھتے ہی بڑی امی نے دریافت کیا۔

"نہیں، جاگ رہے ہیں۔" وہ دراز کھول کر پلیٹیں نکالنے لگی۔

"کچھ دن سے دوپہر میں بالکل نہیں سوتے، پہلے تو اچھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی نیند لے لیتے تھے۔" وہ ودیع سے کہنے لگیں۔

"ان کے دوست آئے تھے کچھ دن پہلے تو کسی اچھے ڈاکٹر کا بتا رہے تھے، کہہ رہے تھے ایک بار اسے بھی دکھا لینا چاہیے۔ اب تم آئے ہو تو لے جانا لیکن۔" جانے ان کے پاس ساری باتیں شوہر کی ہی تھیں، [illegible] لاشعوری کوشش تھی باپ کی بیماری، تکالیف یا مضمحل اور کمزور حالت کے ذکر سے اس کا دل پگھلانے کی۔

اسے ماں کی معصومیت پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ ان کی ساری عمر ہی اس کوشش میں گزری تھی، شوہر کی طرف سے بچوں کا دل صاف رکھیں اور بچوں کی طرف سے شوہر کا۔ وہ جانتا تھا وہ ایسا ہی کچھ ابا سے بھی کہہ رہی ہوں گی۔

طوبیٰ نے کھانا میز پر رکھا اور چلی گئی۔

کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ شہاب بھائی، بیوی بچوں کے ساتھ آ گئے۔ کل جو گھر سناٹے میں ڈوبا تھا آج وہاں آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد سب کچھ دیر آرام کی غرض سے کمروں میں چلے گئے۔ وہ چوں کہ ذرا دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا اس لیے کچھ دیر کمرے میں وقت گزارنے کے بعد پھر باہر آ گیا۔

شہاب بھائی اور بھابھی ثاقب بھائی کے ساتھ اوپر گئے تھے۔ نیچے ایک بار پھر خاموشی کا راج تھا۔ دھیمی آوازوں کے تعاقب میں وہ ہال کے دروازے پر آیا۔ طوبیٰ پورچ میں بیٹھی دانیہ کے بال بنا رہی تھی۔

"آنٹی! مجھے ناں،"

"دانیہ اگر تم یونہی ہلتی رہیں تو میں نہیں بناؤں گی چوٹی۔" اسے 'فرنچ بریڈ' کا شوق تھا۔ جب آئی اس سے بنواتی اور ناہید بھابھی کا کہنا تھا کہ اس کے بعد وہ دو تین دن تک بال ہی کھولنے نہیں دیتی تھی۔

"میں کہاں ہل رہی ہوں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"بات نہیں کرو بس۔" منہ کھلتے ہی زبان کے ساتھ اس کا سارا جسم متحرک ہو جاتا تھا۔

"مجھے ایک بات کی ٹینشن ہے، آپ وہ دور کر دیں تو پھر میں کچھ نہیں بولوں گی۔"

"تمہیں کاہے کی ٹینشن؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"کیا آپ ان انکل کے ساتھ چلی جائیں گی جو آئے ہیں؟" اس کے ہاتھ رک گئے۔ دانیہ نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے باتوں کے مقابلے میں اس نے [illegible]۔

"پھر میرے بال کون بنائے گا، مما کو تو آتی ہی نہیں، آپ کسی کو سکھا کے جائیں۔۔۔ سب سے اچھا تو یہ ہو گا کہ جائیں ہی نہیں آپ۔"

"میرے جانے کی بات کس نے بتائی تمہیں؟" اس نے آہستہ سے دوبارہ اس کے بالوں کی لٹیں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور دھیرے سے پوچھا۔

"کسی نے نہیں۔ میں نے مما اور بڑی آنٹی کی بات سنی تھی، انکل آپ کے ہزبینڈ ہیں آپ نے یہ بتایا کیوں نہیں مجھے؟" طوبیٰ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

"بتائیں ناں، کیوں نہیں بتایا؟" دانیہ نے اس کی خاموشی پر اصرار کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

URDU NOVELS MAG

"یعنی وہ آپ کے ہزبینڈ نہیں ہیں اور آپ ان کے ساتھ نہیں جائیں گی۔" وہ خوش ہو گئی۔

"پھر مما نے کیوں کہا۔ میں بتا دوں گی انہیں۔"

"تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی اور خدارا اب خاموش رہو۔"

"طوبیٰ آنٹی!" ذرا توقف کے بعد وہ منمنائی۔ "میں کنفیوز ہو گئی، انکل آپ کے ہزبینڈ ہیں یا نہیں، اتنا بتا دیں۔"

"اللہ جانے یہ آج کل کے بچے، بھی 'بچے' ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔" طوبیٰ نے دل میں سوچا۔

"جاؤ۔ بن گئے تمہارے بال۔" اس نے آخر کے بچے بالوں کے گرد ہیئر بینڈ کو بل دیے اور پیٹھ تھپتھپا کے اسے جانے کو کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور رخ اس کی طرف کیا۔ کچھ کہنے جا رہی تھی کہ پیچھے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے چونک گئی۔ طوبیٰ نے بھی مڑ کے دیکھا اور پھر جھٹ آگے دیکھنے لگی۔

"آپ ہی بتا دیں انکل۔" دانیہ نے ودیع کو دیکھتے ہوئے پوچھا اور طوبیٰ نے اس کا فراک کھینچ کر اسے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

"کیا آپ آنٹی کے ہزبینڈ ہیں اور انہیں لینے آئے ہیں؟"

جو کام بڑے بڑے نہیں کر پائے تھے، دانیہ نے کر دکھایا۔ طوبیٰ اس کی طرف پشت کیے ساکت بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس نے کہاں سے دانیہ کی باتیں سنی ہیں؟ اور ودیع اس افتاد پر یوں کھڑا تھا مانو بیس سے تیز رفتار یال آ کے سیدھا، سر پر لگی ہو اور جھنجھنایا دماغ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس نے کبھی سوچا نہیں تھا، اسے اس سادہ اور سیدھے سے سوال کا جواب دینا پڑے گا وہ بھی سات آٹھ سال کی بچی کو جو جواب طلب نظروں سے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے اقرار میں سر ہلا کے ہنکار [illegible] دانیہ کا چہرہ اتر گیا۔

[illegible] ہوگی، دانیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتی ودیع کے بازو سے گزرتی اندر چلی گئی۔ ودیع کو یہ سوال جواب کسی سے نہ کہنے کی ہدایت دینا فضول تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

"ہوں۔" سارے کمرے میں جیسے ودیع کی سنجیدہ آواز پھیلی تھی۔

"پاگل مت بنو۔ بھلا دانیہ کو اور کیا کہا جا سکتا تھا، اس نے نہیں کہا ہے نہ ہاں۔" وہ خود کو سمجھانے لگی۔

وہ دل و جان سے اس 'ہوں' کو اقرار ماننا چاہتی تھی لیکن خود حقیقت شناس ہونے کا احساس اسے روک رہا تھا۔

ہال میں تنہا کرسی پر بیٹھا ودیع اس کے اس طرح جانے کو 'ڈی کوڈ' کر رہا تھا۔

"کیا اسے میرا 'ہاں' کہنا اچھا نہیں لگا؟"

☆☆☆

گھر میں وہ بھی ملنے آ رہے تھے جو اسے یاد نہیں تھے۔ اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر ان سب سوالوں کے جواب دہرانے پڑتے جو پردیس میں تنہا رہنے والے سے پوچھے جاتے ہیں۔ کچھ تو صرف اس لیے ملنے آتے تاکہ وہ انہیں یا ان کے کسی لڑکے کو بھی [illegible] وہاں جانے [illegible] کرنے کی ساری تفصیل درکار ہوتی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا وہ پردیس جا کر کام کرنے والوں کے لیے کوئی کنسلٹنگ فرم چلا رہا ہے۔

اس کے دوستوں نے بھی خبر ملنے پر اس سے رابطہ کیا تھا۔ وہ ان سے ملنے گھر سے نکلا تو دیکھا اس کا شہر بھی بدل گیا تھا۔ نو سال بعد کئی نئی جگہیں، نئی چیزیں آ گئی تھیں اور کچھ پرانی چیزیں اب عمارد تھیں۔ شہر کا چپہ چپہ گھومتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اسے اپنا شہر کتنا پیارا تھا جو سیرابی اب اس کے اندر اتری تھی اس نے اسے اپنے شہر کی اہمیت کا احساس کرایا تھا۔

"تو کیا میں اتنے سالوں سے محسوس کرنے کی حس کھو بیٹھا تھا؟" ہر احساس پر وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔

"یا مجھ پر صرف دو ہی احساس حاوی تھے؟"

ایک باپ سے۔ جڑا تھا اور ایک طوبیٰ سے۔

شام میں ثاقب بھائی آئے تو سموسے کے لفافے ان کے ہاتھ میں تھے۔

"تمہارے فیورٹ سموسے۔" انہوں نے طوبیٰ کو آواز دی اور لفافے اسے تھما دیے۔

"تم نکالو جب تک میں چینج کر کے آتا ہوں۔"

اسے ان سموسوں سے کیا کیا نہیں یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

ابا دفتر کے کسی کام سے دوسرے شہر گئے تھے اور اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سارا دن پتنگ بازی میں لگا رہا تھا۔ پتنگ اڑاتے اور لوٹتے ہوئے وہ گھر سے دور جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور جب اندھیرا ہونے کے بعد فون کی 'ڈیڈ بیٹری' کے ساتھ رات کو گھر پہنچا تو اس کے 'ڈیڈ' ہونے کا سامان سامنے موجود تھا۔ ابا شام سے گھر آ گئے تھے اور بیلٹ ہاتھ میں تھامے بے قراری سے اس کے استقبال کے لیے ٹہل رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی [illegible] کے ساتھ طوطے بھی اڑ گئے اور ابا اسے عمر بھر کے لیے دوبارہ ایسی عیاشی سے باز رکھنے پر اڑ گئے۔ اس دن بالآخر امی کی مداخلت پر اس کی دھنائی رکی تھی۔

وہ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے پہلے ہی تھکا ہوا تھا رہی سہی کسر پٹائی نے پوری کر دی۔ جسم کا رواں رواں درد سے چیخ رہا تھا لیکن وہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس میں رونے اور دہائی دینے کا بھی دم نہیں بچا تھا۔ مار بھی بڑے دنوں بعد پڑی تھی ورنہ نویں جماعت کے بعد ثاقب بھائی اور شہاب بھائی کی روایت قائم رکھتے ہوئے ابا نے اسے بھی پیٹنا چھوڑ دیا تھا۔

"اسی لیے تمہیں روک رہا تھا کہ مت جاؤ۔ بڑے ابا نہ بھی آتے شام میں تو انہیں کسی نہ کسی سے پتا چل ہی جانا تھا۔" طلال افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز، چپ رہو اس وقت مجھ میں سننے کی تو دور مرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔" اس نے بے زاری سے بدقت کہا۔ اسے اس وقت زندگی اور دنیا کی ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی ہلکے سے دروازہ کھول کے طوبیٰ نے اندر جھانکا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور دعا کی کہ وہ چلی جائے۔ طوبیٰ نے اندر داخل ہو کے دروازہ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈھکی ہوئی پلیٹ تھی۔ اپنے پسندیدہ سموسوں کی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتے ہی وہ دکھن اور پٹائی کی شرمندگی سب بھول گیا۔ اچانک اسے یاد آیا وہ کتنا بھوکا ہے۔ وہ کھانا سوچتے سوچتے ہی گھر آیا تھا کہ ہاتھ دھوتے ہی باورچی خانے میں گھسے گا۔

طوبیٰ نے خاموشی سے پلیٹ بستر پر اس کے سامنے رکھی اور پھر اوپر ڈھکی پلیٹ ہٹا دی۔ وہ سموسوں پر جھپٹا ہی تھا کہ طلال نے ہاتھ پر چپت ماری۔

"ہاتھ تو دھو لو۔" وہ پھرتی سے اٹھ کر ہاتھ دھونے بھاگا۔ اس پل وہ سب بھول گیا تھا۔

"یہ کون لایا؟" طلال نے کچھ تعجب سے پوچھا۔

"بڑے ابا کے آنے کے بعد امی کے ساتھ بازار گئی تھی، واپسی میں اس 'شرماجی' کی طرف سے گزرے تو لے لیے۔" اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ امی کو اس راستے سے لائی تھی۔

"تھینک یو۔ تھینک یو۔" اس نے چادر پر پھیر کر ہاتھ خشک کیے اور سموسہ اٹھایا۔ اس کا حال یوں تھا مانو تارک الدنیا ہونے کا فیصلہ کرتے ہی کسی نے اس کے آگے زمانے بھر کی رنگینیاں رکھ دی ہوں۔

"اس احسان کے بدلے تم میری جان بھی مانگ لو کبھی تو دے دوں گا۔" اس نے اتنا بڑا لقمہ توڑا تھا کہ بھرے منہ سے بمشکل بول سکا۔

"بس۔ سموسوں جتنی قیمت ہے تمہاری جان کی؟" طلال نے تمسخر سے کہا۔

"یہ عام سموسے ہیں نہ عام سچویشن۔ اس وقت ان کی قیمت اور قدر کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں اس کے بدلے طوبیٰ کو اپنی جان دینے کو تیار

ہوں۔" وہ کسی قحط زدہ بھوکے کی طرح کھا رہا تھا۔

"مجھے نہیں چاہیے کسی کی جان۔" اس نے گھبرا کے اس تیزی سے کہا جیسے وہ اپنی شہ رگ پر چھری رکھے ہو۔

"طوبیٰ!" اس نے نوالہ حلق سے اتار دیے ہوئے ہاتھ روکا۔

"تم یہ سموسے یاد دلا کر مجھ سے کچھ بھی منوا سکتی ہو، آئی پرامس، انکار نہیں کروں گا۔"

"انکار نہیں کروں گا۔" طلال نے اس کی نقل اتاری۔

"پیچھے سے بڑے ابا کی آواز آئے گی اور کون طوبیٰ، کون سے سموسے، کیسا پرامس!" طلال نے آگے آ کر ایک سموسہ اٹھایا۔

"تم آزما لینا طوبیٰ! ان سموسوں کی قسم۔" اس نے طلال کو گھورتے ہوئے پلیٹ اس کی پہنچ سے دور کی۔

طوبیٰ نے ٹرے میز پر رکھی تو وہ ماضی کے منظر سے باہر آیا۔ وہ سنجیدہ سی شکل لیے واپس جا رہی تھی۔

"تمہیں بھی تو سب یاد آ رہا ہوگا۔" اس نے اسے باورچی خانے میں غائب ہوتے دیکھا۔

دونوں نے ہی اب تک اس چند سطری پیغام کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھے تازہ سموسوں کو دیکھا۔ اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں لیکن اس وقت اس واقعے کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"ضروری نہیں وہ میسج ملا ہی ہو۔ کیا پتا وہ نمبر اب کسی اور کے یوز میں ہو اور اسے ایک انجان نمبر سے آئے عجیب سے میسج میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔" اندر وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔

"اگر واپس آنے کی وجہ وہ میسج ہوتا تو اب تک کچھ تو کہا ہوتا۔"

دل یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس پیغام کی وجہ سے آیا ہے لیکن ذہن کو سارے شواہد اس کے خلاف محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اسے صبح چار پانچ بجے کے بعد ہی نیند آئی تھی۔ وہ ٹی وی دیکھنے کے ارادے سے ہال میں آیا تھا اور وہاں طوبیٰ کو دیکھتے ہی قدم رک گئے۔ اسے دیکھتے ہی وہ جانے لگی تھی کہ ودیع نے پکارا۔

"طوبیٰ!" اسے رک کر اسے دیکھنا پڑا۔

"بیٹھو۔" آگے جا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم سے بات ہی نہیں ہو پائی ابھی تک۔"

طوبیٰ کو لگا وہ لمحہ آ گیا ہے جس سے وہ بچ رہی تھی۔ سست قدم اٹھاتی وہ صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھی اور پاس پڑا کشن اٹھا کے گود میں رکھ لیا۔

ان کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ اسکول بھی ایک ہی تھا تاہم ان میں کوئی خاص یا غیر معمولی قربت نہیں تھی۔ ثاقب بھائی اور شہاب بھائی کی نسبت وہ طلال اور ودیع کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود وہ طلال کو نام سے بلاتی تھی۔ اول اول سب نے اسے، بڑے ابا غصہ ہوں گے، کہہ کر سمجھایا، ڈرایا لیکن جب بڑے ابا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس کی عادت پکی ہو گئی۔ پھر وہ طلال کی طرح ودیع کو بھی نام سے مخاطب کرنے لگی۔

جیسے ایک گھر میں رہنے والے بہن بھائیوں اور کزنز کے تعلقات ہوتے ہیں، ان کے بھی ویسے ہی تھے۔ وہ اکثر طلال اور اسے بڑے ابا کے عتاب سے بچا لیا کرتی، ان کے لیے بہانے بناتی اور کبھی جھوٹ بھی بول دیتی تھی۔ بڑے ابا گھر میں ہوتے تو سب ہی اپنی جگہ خاموشی سے کام میں یا پڑھائی میں لگے ہوتے تھے لیکن ان کی غیر موجودگی میں وہ تینوں اکثر ساتھ بیٹھ کر پڑھتے، گپیں لگاتے یا پھر ٹی وی پر کچھ دیکھ لیتے تھے۔

وہ چاہتا تھا، دونوں درمیان کے نو سال بھلا کر بات کریں۔ اگر وہ اس سے کترا رہی تھی تو یہ اس کا مسئلہ تھا، اسے ہی حل کرنا تھا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے آج پہل کی تھی۔

"تم نے آگے یونیورسٹی جوائن نہیں کی؟" اس نے اپنے جانے کے وقت سے بات شروع کی تھی۔ ان دنوں اس نے ہی زور و شور سے اسے بتایا تھا کہ اب وہ ماسٹرز کے لیے یونی ورسٹی کیمپس جایا کرے گی۔

"نہیں۔" وہ سر جھکا کے انگلی میں پڑی انگوٹھی گھمانے لگی۔

"میری وجہ سے؟" وہ ایسی دو ٹوک بات کبھی نہیں کرتا تھا جیسی اس وقت کر رہا تھا۔ اصل 'وجہ' کسی کی زبان پر نہیں آ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ بھی ایسی ایمان دار پہلے نہ تھی۔

"کچھ وقت بعد تو کنٹی نیو کر سکتی تھیں۔" وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔

"وقت گزرنے کے بعد تو سب کچھ اور مشکل ہوتا گیا۔" اچانک اس نے سر اونچا کیا۔ اسے بھی چھپن چھپائی والا کھیل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ٹین ایجرز نہیں تھے، گزرے وقت نے انہیں پختگی اور بالیدگی عطا کی تھی اور دو سلجھے اور سمجھ دار انسانوں کو اس عجیب اور بے آرام کرنے والی صورت حال سے گفتگو کا حل ہی نکال سکتا تھا۔

"اور تمہارے لیے؟ وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں آسانیاں ملیں؟" طوبیٰ نے پوچھا۔

"میں آسانیوں کی تلاش میں نہیں گیا تھا۔"

وہ پھر آنکھیں جھکا کر انگوٹھی سے چھیڑ خانی کرنے لگی لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"تم جس بھی مقصد سے گئے تھے، کیا وہ پورا ہوا؟"

وہ کہہ دیتا، میں تو ملازمت کے لیے گیا تھا اور وہ مقصد اب تک پورا ہو رہا ہے لیکن وہ اتنے اجنبی بھی نہیں تھے۔

"آنسٹلی، مجھے نہیں پتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"تم اتنے سالوں سے ایک ہی جگہ تھے؟" خاموشی اور اس پر ٹکی ودیع کی نظریں ہی نہیں اسے اپنے چہرے کے تاثرات پر بھی بھروسا نہیں تھا اس لیے گھبرا کے پوچھا۔

"نہیں، میں نیدر لینڈ، لکسمبرگ کے بعد اب لندن میں ہوں، تمہیں نہیں پتا؟ ثاقب بھائی، شہاب بھائی اور طلال بھی جانتا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ کیا بتاتی کہ اس کے سامنے کوئی اس کا ذکر کرتا ہی نہیں تھا۔ جانے وہ اپنی دانست میں اسے دکھ سے بچاتے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔ اگر بات چل بھی رہی ہوتی تو اسے دیکھتے ہی سب موضوع بدل دیتے۔ کچھ کھوج کی کوشش اس نے بھی کبھی نہیں کی۔ پھر چپ کی چادر تن گئی۔ جتنی باتیں ان کے دلوں میں تھیں، ان کے لیے رات بھی کم تھی لیکن شرط انہیں زباں پر لانا تھی۔

"تم نے کہا۔" ذرا دیر بعد ہال میں ودیع کی دھیمی آواز ابھری۔

"وقت گزرنے کے بعد سب اور مشکل ہو گیا تھا، تمہارے لیے مشکل تھا۔" اس سے یہ سوال بھی ظلم تھا لیکن وہ جاننا چاہتا تھا۔

طوبیٰ نے زخمی نگاہ سے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر پوری اس کی طرف گھومی اور پیر بھی صوفے پر رکھ لیے۔ اس کے اندر کوئی تار چھڑ گیا تھا چنگاری کیسے نہ نکلتی۔

"تمہیں پتا ہے یہاں تمہارے متعلق کیا کیا باتیں مشہور ہیں؟" وہ اس کے جواب کے لیے رکی نہیں۔

"تم نے وہاں شادی کر لی ہے، تمہاری بیوی کوئی گوری ہے، تمہارے بچے بھی ہیں، کسی کو یقین ہے تمہاری بیوی کوئی پاکستانی یا بنگلہ دیشی ہے، کچھ کے پاس تمہاری بیوی کی تصویریں بھی ہیں، بہت سوں کا خیال ہے، تم اسی لیے باہر جا رہے تھے کہ مجھ سے شادی نہ کرنا پڑے، اور اکثریت اس بات پر

متعلق ہے کہ اس لیے واپس نہیں آرہے تھے کہ تمہیں میرے ساتھ نہ رہنا پڑے، مجھ کو لگتا ہے تم کب کا مجھے طلاق دے چکے ہو، لیکن گھر والے خاص طور پر بڑے ابا یہ سب سے چھپا رہے ہیں۔ نو سال تک کوئی کسی کے نام پر بیٹھا نہیں رہتا، سو لازمی مجھ میں کوئی عیب، کوئی خامی ہے یا ایسی بات ہے جس کی وجہ سے میں اس گھر میں ہوں تو۔۔۔ کسی کے لیے بڑے ابا بڑی امی ہماری کفالت کا خراج اس طرح وصول کر رہے ہیں۔" وہ سانس لینے کو ذرا رکی۔

"لوگوں کے سوال، نظریں، قیاس سب مجھے تو سال سے اس گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، میں نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے لیکن اس بات پر بھی دنیا مجھے بھولی نہیں بلکہ اس سے ان کے تجسس کو مزید ہوا ملی ہے اور وہ خود ہی خبر لینے یہاں چلے آتے ہیں۔ نو سال بعد وہ اولین جوش نہ سہی مگر لوگ بھولے کچھ نہیں ہیں، جہاں کہیں بھی تمہیں اور مجھے جاننے والے چار لوگ مل جائیں، پلٹ کر ایک یہ ہی ہوتا ہے۔ امی اور بڑی امی سب سے کیسے نپٹتی ہیں وہ الگ داستان ہے اور اپنے ہی گھر کی ممبر اس ٹاپک کو کیسے زندہ رکھے ہے وہ الگ۔ ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ آج بھی سب کو لگتا ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے ذرا اونچی آواز میں پوچھ کر اسے روکا اور وہ چونک کے اسے دیکھے گئی۔ گو اس کی آواز دھیمی تھی پھر بھی تیز لہجے اور مسلسل بات کے بعد یکایک ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔

"ان سب میں تمہیں کیا سچ لگتا ہے؟" اس نے سوال آسان کیا۔

"تم ہی بتا دو، کیا سچ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" جانے وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا تھا، کون سا یقین اس تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے احساس ہوا وہ جذبات کی رو میں بہہ کر لڑکھڑا گئی تھی۔

… کی اسے اپنے نو سال کے بن باس کی وجہ نہیں بتا پا رہا تھا۔ وہ اس کے جانے کی وجہ بھی تھی لیکن یہ بھی سچ تھا، وہ اسی کی وجہ سے اتنے برس لوٹ نہیں سکا تھا۔

ایک بار پھر ان کے درمیان چپ بگل مار کے بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہی نو سال قبل اس گھر کے جانے سے ذرا دیر پہلے بدلے رشتے پر ایک لفظ منہ سے نکال رہے تھے جب کہ ان کے ذہن و دل کی ہر بات اور سوچ اس تعلق کا طواف کرتی تھی۔

"سوری۔" اس کی آواز میں ندامت تھی۔

"میں نے تمہیں اتنی مشکلیں دیں اور اتنے سال تک دیں۔"

"یہ فقط میری مشکلیں نہیں تھیں، انہیں سب نے جھیلا ہے۔"

"یعنی مجھے سب سے سوری کرنا ہوگی۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔ طوبیٰ یونہی نظریں جھکائے خاموش رہی۔

"ثاقب بھائی اور شہاب بھائی اپنے بچوں کے ساتھ کیسے ہیں؟" کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ثاقب بھائی بڑے ابا کے بالکل الٹ ہیں اور شہاب بھائی بیلنس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ثاقب بھائی نے تینوں بیٹوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنے کی بھی کوشش کی لیکن سوائے چھوٹے عبدالرافع کے ان کے ساتھ بڑے دونوں فری نہیں ہو سکے۔ عبدالرحمان کا ٹینتھ کا رزلٹ اچھا تھا لیکن ٹویلتھ میں بہت ہی خراب جب کہ اس نے کالج، اسٹریم، ٹیوشن کلاس سب اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا۔ رزلٹ کے بعد اسے کسی بھی اچھے کالج یا اس کی مرضی کی فیلڈ میں ایڈمیشن نہیں ملا۔ ثاقب بھائی نے بھاری ڈونیشن دے کر آئی ٹی میں جیسے تیسے ایڈمیشن کروایا۔ اب بھی وہ سارے سبجیکٹ کلیئر نہیں کر پاتا ہے اور اس کی اپنی لاجک ہے جس کے مطابق اس مینس کی سب سے بڑی وجہ ثاقب بھائی ہیں۔"

"سب کا کیلیبر مختلف ہوتا ہے، ضروری تو نہیں کہ وہ ڈاکٹر انجینئر ہی بنے، اسے کوئی آسان فیلڈ چوز کرنے دی ہوتی۔" اس کا لہجہ خود بخود تن سا گیا تھا۔

"ثاقب بھائی نے پڑھائی کے معاملے میں بھی بچوں پر اپنی مرضی تھوپی نہ اچھے نمبروں کا پریشر ڈالا۔ آئی ٹی میں جانے کا فیصلہ عبدالرحمان کا اپنا تھا۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

اسے کہنا تو بہت کچھ تھا لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کا ماننا تھا کہ ثاقب بھائی اس کی قابلیت اور ذہنی استعداد جانتے تھے تو انہیں بیٹے کو سمجھانا چاہیے تھا، اسے منانا اور راضی کرنا تھا کہ یہ اس کے لیے مشکل ہوگا۔

"اور شہاب بھائی کی فیملی؟" کچھ توقف کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ تمہارے جانے کے بعد ہی الگ ہو گئے ہیں، کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا، بس انہیں بچوں کے لیے الگ اسپیس چاہیے تھی۔" اس کے قدم نے دوسروں میں بھی ہمت پیدا کر دی تھی تو بڑے ابا بھی بیٹے کی بغاوت کے بعد کمزور پڑ گئے تھے۔ انہوں نے پھر کسی پر، کسی بھی معاملے میں اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ان کا بڑا بیٹا توصیف کوئی ڈیزائننگ کورس کر رہا ہے، توقیر اسکول میں ہے اور چھوٹی دانیہ تو ابھی پرائمری میں ہے، تم نے تو دانیہ کو اب دیکھا ہوگا۔" دانیہ کے ساتھ ہی اسے اس کا کارنامہ بھی یاد آگیا۔

"تصویر بھیجی تھی شہاب بھائی نے اور وہ مجھے بالکل امی جیسی لگی تھی۔" وہ مسکرایا، یاد اسے بھی تھا۔

"ہاں، اس میں بڑی امی کی شباہت ہے۔" وہ مسکرائی تو جانے کیوں ودیع کو اس تبسم میں اداسی گھلی محسوس ہوئی۔ نین نقش کے ساتھ اس نے دادی کی گلابی رنگت بھی چرائی تھی۔

"مجھے اب نیند آرہی ہے۔" وہ ایک دم کشن صوفے پر رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بھی سو جاؤ۔" اسے کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک کر پلٹی۔

"کبھی بڑے ابا کے پاس بھی چلے جایا کرو۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ودیع کے تصور میں تھا کہ طوبیٰ کا رویہ اس کے ساتھ اکھڑا اور سرد ہوگا۔ اس کے ذہن سے وہ شدت سے روتی طوبیٰ کبھی نکلی ہی نہیں تھی۔ وہ شبیہ پوری جزئیات کے ساتھ اب بھی اس کی یاد میں زندہ تھی۔ وہ نکاح دونوں کے لیے کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ طوبیٰ کے لیے اپنے جذبات کے باوجود اس وقت اس کے دکھ کی وجہ کچھ اور تھی لیکن تب طوبیٰ کے رونے کی وجہ ایک ہی ہو سکتی تھی کہ ابا نے اس کے ساتھ بھی زبردستی کی تھی۔ اس دن اس کا رونا عام سی گریہ زاری نہیں تھا۔ وہ شاذ ہی روتی تھی لیکن اس دن کی تڑپ اور بے قراری کچھ الگ تھی اور اب اس کا عام سا انداز اسے مزید الجھا رہا تھا۔ مرضی کے خلاف نکاح اور پھر نو سال تک پلٹ کر نہ پوچھنے پر وہ اس کے ساتھ جتنا برا سلوک کرتی جائز تھا لیکن وہ نہ اس کی آمد پر خوش محسوس ہوتی تھی نہ ناراض یا دکھی۔ اس کے رویے نے ودیع کے لیے 'وہ کیا چاہتی ہے؟' اس سوال کا جواب پانا مشکل کر دیا تھا۔

"بڑے ابا اور ان کی بیٹی،" اس نے سیدھا ہو کر سر پیچھے گرایا۔

"نہ پہلے آسان تھے نہ اب آسان ہیں!"

☆☆☆

اسے بڑے ابا کے کمرے میں آئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر سے شور ابھرا۔ اس نے ابھی ان کا مزاج ہی پوچھا تھا۔

"بڑے بھیا اور بھابھی آئے ہیں۔" بڑی امی نے آ کر اطلاع دی۔

"مجھے لے چلو باہر۔" وہ ٹانگوں سے چادر ہٹاتے ہوئے گویا ہوئے۔ ودیع ان سے پہلے کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہچکچایا پھر جھک کر انہیں پلنگ سے اتر کر

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

کھڑے ہونے میں مدد کی۔ بڑی امی تو نہال ہی ہو گئیں۔

جب وہ اس کا سہارا لیے ہال میں آئے تو بیک وقت ساری آنکھیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ اس منظر نے حاضرین کے خدشات کمزور کر کے ان کے اندر ایک خوش گوار سا احساس جگا دیا تھا۔

اس نے انہیں صوفے پر بٹھایا اور تایا ابا کے پاس جا کر ان سے ملنے لگا۔ تایا ابا کے پاس اس کی حرکت کی سرزنش، ضد کے نقصانات، لاتعلقی کی شکایتیں، صلواتیں، سمجھانے والی باتیں مشورے اور اپنی زندگی کے تجربات سے سیکھے سبق تھے۔ وہ سر جھکائے سب سنتا رہا اور سنتے سنتے ہی اسے ادراک ہوا کہ یہ سب وہ اپنے ابا سے سننے کی توقع کر رہا تھا۔

وہ دانیہ، توقیر اور عبدالرافع کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی مگر اس کے کان پیچھے چل رہی گفتگو پر لگے تھے۔

"تاریخ رکھ لی؟" تائی امی ہمیشہ اپنا پان دان ساتھ لاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دیورانیوں کو پان بنا کر دے رہی تھیں۔

"ابھی نہیں۔" امی نے کن اکھیوں سے بیٹی کو دیکھا اور اسے کھیل میں گم دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہا ہے ودیع، ساتھ لے جائے گا یا ہمیشہ کے لیے پردیس چھوڑ کے آیا ہے؟"

"ابھی یہ سب پوچھا نہیں بھابھی۔" بڑی امی نے یوں کہا جیسے جیٹھانی کے سپرد کیے کام میں ان سے کوتاہی ہو گئی ہو۔

"اے لو! تو اتنے دن سے کر کیا رہی ہو تم دونوں؟ نو سال کیا کم تھے جو اور دن گنوائے جا رہی ہو۔" انہوں نے بڑی امی کو پان کی گلوری تھمائی اور نم ململ کے کپڑے میں چھپا دوسرا پان اٹھا کر اس کی ڈنٹھل مروڑی۔

"تیاری شروع کرو، دعوتیں دو، طوبیٰ کو بھیجنا ہے ساتھ تو اس کی تیاری پکڑو اور ان سب سے پہلے بات پکی کرو۔ کہو تو ان سے کہتی ہوں، ابھی بیٹھ کر فیصلہ ہو جائے گا۔"

"نہیں بھابھی۔۔۔" بڑی امی نے تیزی سے ... اور اس کی امی جو جوش میں تائی امی کو ہاں کہنے ... تھیں، سختی سے لب بھینچ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"پہلے میں اس کے ابا سے بات کر لوں ... اتنا تو طے ہے کہ اب طوبیٰ کی رخصتی ہونی ہی ..." انہوں نے دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"آپ اپنی طرف سے پوری تیاری رکھیں ... جب فون کروں، سب کو لے کر آجایئے گا۔" بس ... آخر میں انہوں نے خوش دلی سے ماحول بدلا۔

طوبیٰ نے شکر کیا کہ وہاں خولہ بھابھی موجود نہیں تھیں۔ وہ تائی امی کی بہو کو اپنے ساتھ اوپر لے گئی تھیں۔ اسے علم تھا وہاں کیا باتیں ہو رہی ہوں گی ... پھر بھی یہاں ہو رہے مذاکرے میں ان کا شامل ... ہونا زیادہ سود مند تھا۔

"طوبیٰ آپی!" عبداللہ نے اندر آکر اسے پکارا۔

"پاپا چائے کا کہہ رہے ہیں۔"

وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔

☆☆☆

تایا ابا دو دن رکے رہے اور یہ وقت اس کے لیے بڑا کڑا ثابت ہوا۔ انہوں نے اس کی شادی کا ذکر سب کے سامنے چھیڑ دیا تھا غنیمت تھا کہ اس وقت ودیع موجود نہیں تھا۔

"جب اور جیسا ودیع کہے گا۔" بڑے ابا کے جواب نے جہاں سب کو مطمئن کیا کہ اب کوئی بچا پن نہیں ہو گا وہیں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے تو بچوں کا بھلا چاہا تھا، ذمہ دار باپ کے فرائض نبھائے تھے اور آخر میں وہ کس قدر بے بس اور مجبور تھے اور اس میں کچھ ہاتھ اس کا بھی تو تھا۔

☆☆☆

"میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس گھر میں چل کیا رہا ہے۔" وہ جو سگریٹ کی طلب میں تاریک حصے میں جا رہا تھا کہ اوپر جانے والی سیڑھیوں سے

آتی خولہ کی آواز پر رک گیا۔

"شادی، رخصتی کی بات کوئی منہ سے نکال نہیں رہا نہ وہاں اس نے کون سے گل کھلا رکھے ہیں، یہ کوئی پوچھتا ہے، وہ ... وہ تو آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے اس کے، رات میں جب بھی دیکھو دونوں کسی کونے کھدرے میں دبکے ہوتے ہیں، اور نہیں تو کیا، اب بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون! اور تو اور۔" ان کی بات جاری تھی لیکن وہ پلٹ گیا۔ ان کی بکواس اور مبالغہ آرائی پر اسے غصہ آرہا تھا۔

بے خیالی میں اندر آتے ہوئے وہ سگریٹ سلگا چکا تھا۔ کش لیتا ہوا وہ راہداری میں آیا اسی وقت طوبیٰ اپنے کمرے سے نکلی اور اسے اس دیدہ دلیری سے کش لگاتے دیکھ پہلے حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھیل گئیں پھر ایک دم گھبراہٹ طاری ہوئی۔

بڑے ابا بھلے کمرے تک محدود تھے لیکن گھر اب بھی ان کے بنائے اصولوں پر چل رہا تھا۔ ان کا رعب اور دبدبہ اب بھی اتنا تھا کہ اس گھر میں سگریٹ کی بو بھی ممنوع تھی اور اس وقت سب سوئے بھی نہیں تھے۔ وہ کچھ کہتی اس سے پہلے ہی ہال سے عبداللہ اور عبدالرافع کی آواز ابھری اور اس نے بنا سوچے سمجھے ودیع کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں گھسیٹ لیا۔

"پاگل ہو گئے ہو تم؟" وہ برہم تھی۔

"گھر میں بچے بھی ہیں، ان کے سامنے سگریٹ پیو گے؟"

"پہلے بڑوں کے سامنے پینا منع تھا، اب بچوں کے سامنے بھی؟"

"اس گھر میں سگریٹ ہی منع ہے۔ اللہ کرے بچے بو کا پیچھا کرتے ادھر نہ آجائیں۔" اس نے ہاتھ مار کے دھوئیں کے مرغولے اور بو دور کرنی چاہی۔

"دنیا بہت بدل گئی ہے طوبیٰ! بچے اس بات پر خوش ہوں گے کہ کوئی اس گھر میں سگریٹ پیتا ہے اور بو کا پیچھا کرنے کے بجائے اسے راز رکھیں گے تاکہ اگلی دفعہ کوئی ان کا راز بھی چھپا سکے۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے ایک لمبا کش لیا اور جلتی سگریٹ میز پر دھرے پانی کے جگ میں ڈال دی۔

"کیا پتا چھپ چھپا کر یہ کام کب سے اس گھر میں ہو رہا ہو اور کسی کو خبر نہیں۔" وہ پلٹ کر گویا ہوا۔

"تم اتنا منفی کیوں سوچتے ہو؟" اس نے وہیں کھڑے کھڑے دھیرے سے پوچھا۔

"منفی، مثبت کی بات نہیں جو ماحول اور حقیقت سے قریب ہے، وہ بات کر رہا ہوں۔ میں نے سگریٹ فرسٹ ایئر میں شروع کی تھی۔"

"تم تب سے اسموکنگ کر رہے ہو؟" اسے دھچکا لگا تھا۔

"میں عادی نہیں ہوں۔ لیکن وہاں کے موسم میں کبھی کبھی پینی پڑتی ہے۔" اس نے اس کا صدمہ کم کرنا چاہا۔

"ویسے پابندیاں سب سے بڑی موجد ہیں چور راستوں کی، تم بھی اس بات کی گواہ ہو۔" وہ مسکرایا۔

"میں، ؟" اس نے تعجب سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے ابا سے بچانے کے لیے تم نے بھی چور راستہ انوینٹ (دریافت) کیا تھا۔" وہ جانے کس چور راستے کی بات کر رہا تھا، اسے تو کئی یاد آگئے۔

"مجھے ہندی ٹیسٹ میں دو مارکس ملے تھے تب تم نے اپنے ٹیسٹ پیپرز کے ساتھ مکس کر کے میرے پیپر پر بھی ابا کے سائن لیے تھے۔" تعلیمی میدان میں ان چاروں کے مقابلے میں اسے ہمیشہ رعایت حاصل رہی تھی۔ وہ زبانی اپنے نمبر سنا دیتی تو بڑے ابا مان جاتے۔ باقیوں کے پرچوں کی طرح پوسٹ مارٹم کر کے اور ہر غلطی پر تھپڑ رسید کرنے کے بعد دستخط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ پرچے ان کے سامنے رکھتی اور وہ نمبر کہتی جاتی وہ بنا دیکھے ہی سنتے ہوئے دستخط کرتے جاتے۔ اس بار اس نے اپنا ایک پرچہ کم کر کے اس کی جگہ درمیان میں ودیع کا جوابی پرچہ رکھ دیا تھا اور ودیع سے کہا تھا وہ بہانا بنا دے کہ

ہندی کے استاد نے جوابی پرچے دیے ہی نہیں۔ یہ چال بازی عام کلاس ٹیسٹوں میں ہی ممکن ہو پائی تھی۔

طوبیٰ کو اچھی طرح یاد تھا۔ اس بنا دستخط والے پرچے کی وجہ سے بطور سزا اسے ایک پیریڈ کلاس کے باہر کھڑے رہنا پڑا تھا۔ وہ خاموشی سے جگ میں تیرتے سگریٹ کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں یاد ہے، مجھے تب کرکٹ گیم کارڈز جمع کرنے کا کتنا شوق تھا؟" اچانک اس نے پوچھا۔ کرکٹرز کی پیشہ ورانہ تفصیل اور ریٹنگ والے کارڈز اس کے پاس بے شمار تھے۔ طوبیٰ نے سر ہلایا۔

"ابا جی کبھی کمرے میں آ کر تلاشی شروع کر دیتے تھے، ان کے ڈر سے وہ سارے کارڈز چھپانے کے لیے ایک جگہ بنائی تھی میں نے، کیا پتا اب بھی کارڈز ہوں وہاں۔" اس نے پلنگ کے ساتھ رکھی تپائی پلنگ سے دور کی۔ وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ودیع نے تپائی ہٹا کر پلنگ کو تھوڑا دائیں طرف دھکیلا پھر فرش پر بیٹھ کر پلنگ کے نیچے، پہلی قطار والی ٹائلیں انگلیوں سے بجا کر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ رک کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر تپائی پر رکھی کتاب سے پنسل نکال کر اس کی مدد سے ٹائل اس جگہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد ٹائل ہٹائی تو اس کے نیچے دو ڈھائی انچ گہرا خلا تھا۔

"حق ہا! کارڈز تو نہیں ہیں لیکن خفیہ تہہ خانہ اپنی جگہ موجود ہے۔" وہ خود ہی محظوظ ہو کر ہنس دیا۔

"تم بھی چاہو تو یہ سیکرٹ جگہ یوز کر سکتی ہو۔" بچپن کی یادوں اور باتوں نے اس کی طبیعت بشاش کر دی تھی۔ طوبیٰ بس مسکرا کر پیچھے ہو گئی۔ اس کے پاس کیا تھا جو یوں چھپانا پڑتا۔ اس نے ٹائل اسی جگہ لگایا پھر پلنگ اور تپائی سابقہ جگہ پر سرکائی۔ یہ سلیقہ تنہا رہنے نے اسے سکھایا تھا۔

"اتنے سالوں میں اس پر کبھی بیڈ یا ٹیبل کا فوٹ نہیں پڑا اور نہ ٹائل ٹوٹ کر اندر دھنس جاتی۔" یہ چیزوں کی جگہیں بدل لیں تاہم کمرے کا حدود اربعہ ایسا تھا کہ پلنگ ہمیشہ اسی جگہ رہا۔

وہاں سے ہٹنے یا پلنگ پر بیٹھنے کے بجائے وہ پلنگ سے پیٹھ لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

"تم اس کمرے میں کب سے ہو؟"

"تمہارے بعد طلال تو یہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں ادھر آ گئی۔" وہ فرش پر بیٹھا تھا اور اسے یوں کھڑے ہو کر اس سے بات کرنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آرائشی آئینے کے اسٹول پر بیٹھ جائے یا اس کی تقلید میں فرش پر، فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ کتنے سوال اس کے اندر مچل رہے تھے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لیے واپس آ گیا ہے اس لیے اپنے کمرے کے متعلق بات کر رہا ہے، وہ اب اس کمرے میں رہنا چاہتا ہے، کچھ دن کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔

"پتا نہیں کیوں اچانک ہی مجھے اس وقت اس کمرے سے جڑی بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔" اسے خود بھی اپنے عجیب رویے کا احساس تھا۔

"تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا سامان دوسرے روم میں شفٹ کر لیتی ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

"میں کل شفٹ کر لوں گی۔"

"نہیں۔" اس نے درمیان میں ہی روکا۔

"میں اُدھر بھی ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی پرانی باتیں یاد آ رہی ہیں۔" وہ اس کے پیچھے دیواروں کو دیکھنے لگا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنی گدی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ لگاتار سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہو کر آرائشی میز کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

"اتنے سال یورپ میں رہنے کے بعد اب تمہیں یہاں کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہو گا۔" مرمت اور دیکھ بھال کے باوجود مکان کا یہ حصہ پرانا تھا۔ اس نے اسے فون پر بات کرتے سنا تھا، اس کا 'انگلش ایکسنٹ (لہجہ)' سن کر اسے پہلی احساس ہوا کہ وہ اتنا طویل عرصہ وہاں رہتے ہوئے وہیں کا باسی لگنے لگا ہے۔ اس کا لباس اور حلیہ تو بدل ہی گیا تھا، اب پر اس کے انگریزی بولتا وہ اسے اجنبی لگا۔ اس کی بات سن کر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس ہنسی میں تو سالوں کا اکیلا پن اور حسرتیں تھیں۔ طوبیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"گھر گھر ہوتا ہے طوبیٰ!" ودیع نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ اعتراف ایک طرح سے اس کی شکست تھا اور یہ وہ اسی کے سامنے کر سکتا تھا۔

"نو سال سے میں بنجارے سی زندگی جی رہا ہوں۔" طوبیٰ کا دل کیا پوچھے۔

"تو کیا اب خانہ بدوشی سے توبہ کر لی ہے؟" مگر وہ خاموش رہی۔ وہ 'کیوں بنجارے سی زندگی جی رہے ہو؟' نہیں پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کا جواب اسے معلوم تھا لیکن اسے 'اب کیا؟' کا جواب سننے کی بے چینی تھی۔

"تم اکیلے رہتے ہو، میرا مطلب ہے فلیٹ شیئرنگ ہے یا تم ہی ہوتے ہو؟" اس نے اپنی بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کے بات آگے بڑھائی۔

"یہاں سے جانے کے بعد دو سال سے زیادہ تو شیئرنگ میں رہا۔"

اس نے کہنا شروع کیا اور پھر اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وہ وہاں اپنے قیام اور کام کی تفصیل اس قدر مفصل بیان کرنے لگا کہ اسے نہ وقت کا اندازہ رہا نہ اس نے نیند سے بے حال ہوتی طوبیٰ پر توجہ دی۔ اتنی باتیں وہ عرصے بعد کر رہا تھا، پہلی بار وہ خود پر گزری سنا رہا تھا، اسے یہ اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ سناتے ہوئے وہ کھو سا گیا تھا۔

وہاں کی زندگی اس کے لیے آسان نہیں تھی اور پہلی بار کسی نے پوچھا تھا۔ سر جھکا کر بولتے ہوئے جب اس نے اوپر دیکھا تو ایک دم رک گیا۔

وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہتھیلی پر گال رکھے سو گئی تھی۔ وہ جس انداز میں بیٹھی تھی اسی انداز میں لیٹ گئی تھی۔ اس کے گھٹنے مڑے ہوئے تھے۔

اس نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ جمائیاں روکتے روکتے بے حال ہو گئی تھی لیکن اسے درمیان میں ٹوکنا، روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ذرا نہیں بدلی تھی۔ اسے آج بھی بڑے ابا کی محبت کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کے عتاب کا شکار بننے والوں کی بھی اتنی ہی فکر تھی۔

وہ پیچھے مڑا اور ہاتھ بڑھا کے پلنگ سے تکیہ لیا پھر اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

"کہیں جاگ نہ جائے۔" وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر جھک کر احتیاط سے اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ سیدھا ہونے کے بجائے وہ پنجوں کے بل وہیں بیٹھ گیا۔

اس کے چہرے پر عمر کی پختگی تھی، الھڑ پن کی جگہ سنجیدگی تھی، اندازِ گفتگو کا ٹھہراؤ چہرے پر بھی ٹھہرا نظر آتا تھا، سانولے چہرے میں اتنے وقت بعد بھی معصومیت تھی لیکن ہمیشہ اس کی شخصیت کا حصہ رہنے والی شوخی اور شرارت مفقود تھی۔

"کیا یہ میں نے چھین لی ہے؟" اس نے ہلکے سے اس کے گال کو چھوا۔

اس نے اتنے برس اسے سوچا تھا، چاہا تھا اور صبر کیا تھا۔ اس کی طلب تھی یا تھکن جو وہ باپ کے ساتھ بندھی ضد سے ذرا دیر کو نظر پھیر کر یہاں چلا آیا تھا لیکن اب بھی اسے دل کا حال سنانے سے قاصر تھا۔ وہ جب بھی ارادہ کرتا، روتی بلکتی طوبیٰ چھم سے اس کے سامنے آ جاتی اور اپنی آخری امید وہ جتنی دیر ہو سکے قائم رکھنا چاہتا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھا اور پلنگ سے لحاف اور دوسرا تکیہ لے کر واپس آیا۔ لحاف اس کے اوپر پھیلا کر اس سے ذرا فاصلے پر تکیے پر سر رکھ کے وہ بھی لیٹ گیا۔ بتی اسی طرح جل رہی تھی۔

"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے طوبیٰ؟" وہ دل میں سوئی طوبیٰ سے جواب مانگ رہا تھا۔

اتنے برسوں میں جو ضد ختم نہیں ہوئی تھی، وہ باپ کو دیکھ کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ان سے شکایتیں اور ناراضی اپنی جگہ لیکن انہیں اس حالت میں دیکھ کر

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

اس کا دل دکھی تھا، اسے افسوس تھا۔ اس کے اندر یار بار پرانے جلالی اور سخت گیر باپ کی شبیہہ ابھرتی تھی۔ اس نے جانا کہ اس کا ذہن باپ کو اسی روپ میں قبول کرتا ہے۔ وہ انہیں ویسا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ کمزور، لاغر اور محتاج سے باپ کو دیکھ کر اس کے اندر "ظالم کا یہ ہی انجام ہونا چاہیے۔" جیسا کچھ نہیں گونجا تھا اور اسے اس بات پر حیرت تھی کیوں کہ وہ خود کو یہ ہی یقین دلاتا رہا تھا کہ ایک دن ابا کو ان کی غلطیوں، سختیوں کی سزا ملے گی۔ اس وقت تو اسے تنفر سے گردن تان کر انہیں جتانا چاہیے تھا لیکن وہ خود اپنے اس بوجھل سے ردعمل پر حیران تھا۔

طوبیٰ کے چہرے پر نظر جمائے وہ بڑے ابا کو سوچتا جانے کب سو گیا۔

☆☆☆

"تم اتنی بولڈ ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔" خولہ بھابھی نے اسے شانے سے دھکا دیا تو وہ اس افتاد پر گرتے گرتے بچی۔

"بولڈ؟" اسے خاک سمجھ میں آیا۔

"اب بنو مت، کل رات ودیع تمہارے کمرے میں ہی تھا۔" اسے جس قدر زور کا جھٹکا لگا اس نے باہر خود کو اتنا ہی شانت رکھا۔

"ہاں، باتیں کرتے کرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ صبح سو گیا لیکن مجھے تو کام ہوتے ہیں۔" اس نے کشن جھٹک کر واپس جگہ پر رکھتے ہوئے عام سے انداز میں کہا اور زبردستی کی جمائی لی۔

"اب دوپہر میں ہی سونے کو ملے تو ملے۔"

"لیکن وہ تمہارے کمرے میں آیا کیوں تھا؟" وہ اپنے نام کی ایک ہی خولہ تھیں۔

"اسے یاد آیا تھا کہ کمرے میں اس کی ایک خفیہ جگہ تھی، بڑے ابا سے بچا کے کارڈز وغیرہ چھپانے کی، وہ دیکھنے آیا تھا کہ اب بھی ہے یا نہیں۔"

"پھر۔۔۔ مطلب ملی وہ جگہ؟"

"ہاں ... نیچے والی ایک ٹائل نکل جاتی ... یں چھپاتا تھا۔ آپ کو دیکھنا ہے؟" وہ ایک دم ان کی سمت مڑی۔

اسی وقت بکھرے بال اور الجھے حلیے کے ساتھ جمائیاں لیتا ودیع ہال میں آیا۔

"خولہ بھابھی کو بھی سیکریٹ جگہ دکھا دو۔" اس نے بلاسوچے سمجھے کہا۔

"آں؟"

"اب رہنے بھی دو۔" خولہ بھابھی نے منمناتے ہوئے اس کی آستین کھینچی۔ اس نے پلٹ کر صوفے کے کشن ٹھیک کرتے ہوئے خود کو شاباش دی۔

"ممما!" اوپر سے عبدالرافع حلق پھاڑ کر چلایا۔ "میرا بلیو اسپورٹس ٹی شرٹ نہیں مل رہا ہے۔"

"کرسی پر رکھا ہے نکال کے۔" وہ اس کے جتنی ہی اونچی آواز میں کہتی اوپر والی سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

"سوری۔۔۔" وہ اس کے پاس آیا۔

"کل رات میری آنکھ لگ گئی تھی۔"

طوبیٰ جانتی تھی آنکھ پہلے اس کی لگی تھی اور اس کے بعد ودیع کو کمرے سے چلے جانا چاہیے تھا، اسے تکیہ اور لحاف یاد تھا اور سامنے سویا ودیع بھی۔

"خولہ بھابھی کو جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے اور ان سے کوئی بات چھپ بھی نہیں سکتی۔"

"میں خیال رکھوں گا۔" اس نے اس کی بات کے درمیان ہی تیزی سے کہا۔ طوبیٰ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور چلی گئی۔ وہ وہیں صوفے پر گر گیا۔

☆☆☆

آج گھر میں سب اکٹھا تھے۔ طلال موجود تھا اور عبدالرحمان بھی چاچو سے ملنے آیا تھا۔

کھانے کے بعد سارے مرد سب کو نیچے چھوڑ کو خود اوپر چلے آئے تھے۔ پورچ میں کرسیوں پر بیٹھ کر کام، دفتر اور سیاست پر گفتگو کرتے کرتے بات گھر، زندگی اور بچپن پر چلی آئی۔

"دیکھو! ابا فطرتاً نیک انسان ہیں۔ ان میں کوئی شخصی برائی بھی نہیں تھی مثلاً کام چور یا غیر ذمہ دار نہیں تھے، اپنے کام اور پیشے میں ایمان دار تھے، رشتے داروں کے ساتھ بھی ان کا رویہ صلہ رحمی والا تھا بس وہ ہم بچوں کے معاملے میں اسٹرکٹ (سخت) تھے۔" ثاقب بھائی کہہ رہے تھے۔

"صرف اسٹرکٹ؟ ابا ہمارے لیے پورے ہٹلر تھے۔" شہاب بھائی نے تصحیح کی۔

"اب انہیں اتنا بھی وائٹ واش نہ کریں۔ ان کے مزاج اور رویے نے ہماری شخصیت اور مزاج میں کئی خلا اور زخم چھوڑے ہیں۔" اس نے حتی الامقدور لہجہ سادہ رکھا تھا۔

"اس سے انکار نہیں لیکن تم اسے کولیٹرل ڈیمج سمجھو لو جو ہمیں ایک بہتر مستقبل دینے میں ہوا۔"

"یہ بہتر مستقبل بنا کسی کولیٹرل ڈیمج کے بھی دیا جا سکتا تھا۔" شہاب بھائی نے کہا۔

"ویسے پھر آپ نے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ بڑے ابا کے بالکل متضاد رویہ کیوں رکھا؟" طلال نے پوچھا۔

"ہمارا اپنے بچوں کے ساتھ اچھا برا جیسا بھی رویہ ہوتا ہے اس کی سب سے پہلی وجہ ہمارے ماں باپ کا ہمارے ساتھ روا رکھا گیا سلوک ہوتا ہے۔ دادا نے بچوں کی ایجوکیشن یا فیوچر پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، اسکول جانا ہے جاؤ نہ جانا ہے نہ جاؤ۔ ہم نے تایا کو دیکھا ہی ہے، اب بھی گاؤں میں کیسی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے بچے بھی ویسے ہی ہیں۔ ابا نے خود اپنی زندگی بدلی، سنواری اور پھر ہماری بھی۔ انہوں نے چاچا کو بھی اپنے پاس شہر بلایا، انہیں پڑھایا، کسی قابل بنایا، ان کی کوشش تھی وہ محرومیاں ہمارے حصے میں نہ آئیں۔ جو انہوں نے بھگتیں ان کا طریقہ کیسا تھا یا اس نے ہمیں کس بری طرح متاثر کیا انہوں نے اس نکتے پر توجہ نہیں دی۔ ان کی ترجیح اور مقصد ہمارا پڑھ لکھ کر ایک اچھی نوکری حاصل کر لینا تھی اور دیکھ لو ابا اس میں کامیاب ہیں۔" ثاقب بھائی نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"انہیں اپنے ابا سے شکایت تھی، ہمیں اپنے باپ سے شکایت ہے، میرے بچوں کو مجھ سے ہو گی، ان کے بچوں کو بھی ان سے ہو گی، یہی سچ ہے۔ ہم اپنے والدین کی کمیوں، خامیوں اور غلطیوں کو سمجھتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں اور انہیں خود نہ دہرانے کا عزم کرتے ہیں اور مزے کی بات بتاؤں، یہی سائیکل ہمارے بچے بھی دہرائیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے ابا کا تربیت کا انداز ٹھیک تھا؟ ان کی ہم پر لگائی بندشیں اور سختیاں صحیح تھیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن اب میں ان کے اس اسٹائل کے پیچھے کی وجہ اور مقصد کو سمجھتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا، میں اپنے بچوں کے ساتھ وہ سب نہیں کروں گا۔ میں نے خود کو ابا سے یکسر مختلف باپ بنایا۔ بچوں پر سختی نہیں کی اور اب پریشر کے بنا تعلیم مکمل کرنے والے میرے بچے مجھے دوش دیتے ہیں کہ میں نے انہیں ٹھیک سے گائیڈ نہیں کیا۔ عبداللہ نے میری نرمی اور چھوٹ کا وہ فائدہ اٹھایا کہ بالکل ہی لاپروا ہو گیا۔ جب وہ نائنتھ میں فیل ہوا تب مجھے احساس ہوا کہ سختی نہ کرنا اور ایسا چیک رکھنا کہ بچے کو ذمہ داری کا احساس ہو، دو الگ باتیں ہیں۔ عبدالرحمان کہتا ہے بطور باپ میں اس کے رجحانات بہتر سمجھتا تھا اور مجھے اسے کنوینس کرنا چاہیے تھا کہ آئی ٹی اس کے بس کی بات نہیں۔" وہ اداسی سے مسکرائے۔

"خولہ کو بھی شکایت ہے کہ میں بچوں کے فیوچر اور ایجوکیشن کے معاملے میں ڈھیلا ہوں۔"

"اور آپ شہاب بھائی؟" وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں تو آج تک یہ ہی طے نہیں کر پایا کہ مجھے کیسا باپ بننا ہے ابا جیسا سخت یا ثاقب بھائی جیسا نرم، جب بچوں کو ڈھیل دوں تو یاد آتا ہے کہ ثاقب بھائی کو ایسا کر کے کیا ملا، سختی کرتا ہوں تو اپنے دن یاد آجاتے ہیں۔ ابا اور ثاقب بھائی کے بیچ بیچ میں کہیں شہاب بھی آجاتا ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"میں نے تو ہمیشہ بہ حیثیت باپ، خود کو بڑے ابا جیسا ہی تصور کیا ہے۔" طلال نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے ابھی سے تمہارے بچوں سے ہمدردی ہے۔" ودیع نے کہا۔

"میں نے تو درمیانی راہ پر چلنے کی کوشش کی لیکن۔ کچھ ملغوبہ قسم کی پیرنٹنگ اسٹائل (تربیت) ہوگئی ہے میری۔" شہاب بھائی کی بات وہ سب ہنس دیے۔

"کبھی سخت ہو جاتا ہوں، کبھی نرم، کبھی بچوں کا دوست بننے کی کوشش کرتا ہوں تو کبھی بالکل ابا بن جاتا ہوں۔۔ سچ کہوں تو جب بچے میری بات ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں تو لگتا ہے ابا ہی درست تھے، ہماری اولادیں ہماری طرح فرماں بردار نہیں اور ابا کی اتنی سختیاں جھیلنے کے بعد ہم اپنے بچوں سے تھوڑی تو عزت ڈیزرو کرتے ہیں۔"

"ابا کا دور الگ تھا، ہمارا الگ اور انہوں نے اپنے دور سے جو سیکھا، وہ ہم پر لاگو کرنے کی کوشش کی، یہ ہی سچویشن ہماری اور ہمارے بچوں کی ہے۔ ہم کوشش کرتے تو ہیں وقت کے ساتھ چلیں، حالیہ وقت کو مقدم رکھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارا اپنے والدین کے رویے کا تجربہ، تجزیہ اور اثر نہیں جاتا، ہم اسے خود سے الگ رکھ ہی نہیں پاتے۔" ثاقب بھائی پرسوچ سے کہہ رہے تھے۔

"ہر بچے کا مزاج مختلف ہے اور ہر دور کا ماحول الگ، ایک ہی قاعدہ، سیم سا اصول ہر بچے اور ہر ماحول میں نہیں لگایا جا سکتا، ہمیں بطور پیرنٹ ہر لمحے انوالو ہونے کی ضرورت ہے اور بچے کے مزاج کے مطابق اسٹریٹجی بدلنا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ دانائی کی باتیں مجھے وقت گزرنے کے بعد اب سمجھ میں آئی ہیں۔" وہ ہنس پڑے۔

"ثاقب بھائی۔ یہ بھی تو سچ ہے کہ ایک وقت کے بعد ہم اپنے والدین اسپیشلی اباؤں کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں یعنی جب ہم خود اس مقام پر پہنچتے ہیں اور جہاں چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں وہاں۔" شہاب بھائی کہتے ہوئے اچانک اس کی طرف مڑے۔

"ویسے تم ہمارے تجربوں سے سیکھ لو، لیٹ باپ بننے کا فائدہ ہوگا تمہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا آج سے پانچ سات سال پہلے وہ اس موضوع پر بات کرتے تو ان کے خیالات ایسے ہی ہوتے؟ شاید نہیں۔ حالات کے پڑھائے سبق کا درست خلاصہ ایک خاص وقت کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔

"ویسے تم نے کیا سوچا ہے؟ ابا سے بات کی طوبیٰ کے بارے میں؟"

ثاقب بھائی کے اچانک سوال پر وہ سب ہی ٹھٹھک گئے۔

طلال کی موجودگی میں؟ اس نے بے آرامی سے پہلو بدلا۔ طلال سے اس کا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا تھا پھر بھی طلال نے کبھی اسے طوبیٰ کے نام کی دہائی نہیں دی تھی، اسے اس کی خاطر واپس آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ اس کا سالا بننے کے بجائے دوست اور بھائی ہی بنا رہا تھا۔

"ابھی تک نہیں کی۔" وہ تینوں اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے، اسے کہنا پڑا۔

"مطلب۔ تمہارا ارادہ تو ہے نا، تم نے کچھ اور تو نہیں سوچ رکھا ہے؟" شہاب بھائی نے جھجکتے ہوئے طلال کو دیکھا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے کہا اور ان تینوں کے چہروں پر سکون پھیلا۔

"تم خود سے نہیں کہہ پا رہے تو کہو، میں بات کرتا ہوں۔" ثاقب بھائی نے بڑے بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔

"ویسے حیرت ہے کہ ابا نے اب تک تم سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔"

اب تو شہاب بھائی جیسی حیرت اسے بھی ہونے لگی تھی۔

"میں جلد ابا سے خود ہی کروں گا بات۔" اس نے موضوع وہیں ختم کرنے کے لیے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس رات ثاقب بھائی کی باتوں نے اسے سونے نہیں دیا۔

☆☆☆

وہ بڑے ابا کے ناشتے کے برتن لے کر واپس آئی تو خولہ نے بغور اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"مانا بہت وقت ہوگیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہارے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہو۔"

اس بے تکی تمہید پر اس کی پیشانی ناگواری کے اظہار میں شکن زدہ ہوگئی۔

"اب تو کچھ بن سنور کے رہا کرو، آخر شوہر ہے وہ تمہارا۔" وہ اس کی سادگی پر اکثر چوٹ کرتی رہتی تھیں لیکن آج اس کے پیچھے کا مقصد اسے بہت برا لگا۔

"آپ میری فکر چھوڑ دیں بھابھی! اور اپنے شوہر کے لیے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں، یہ مجھے طے کرنے دیں۔" اس نے غصہ چھپایا نہیں تھا۔

کمرے میں آتے آتے اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔ اپنی کم صورتی کے احساس کے ساتھ خولہ کے مشورے کے پیچھے چھپی بات اسے اپنی ذات کی ہتک محسوس ہوئی تھی۔ وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتی تھیں کہ اسے اداؤں اور دوسرے ہتھکنڈوں سے رجھاؤ کہ ایسے تو تم میں متوجہ کرنے والی کوئی بات نہیں، ان کی بات کا یہ ہی مطلب اس کے کانوں میں گونجا تھا۔

اس کا سہا دل ودیع کے رویہ اور باتوں پر خوش ہونے ہی لگا تھا کہ انہوں نے اس کے سامنے یہ آئینہ رکھ دیا۔

"میں اسے ناپسند نہیں۔" وہ آئینے کے سامنے کھڑی ودیع کی نظریں اور باتیں یاد کر رہی تھی۔

"شاید اس وقت میں اسے اچھی نہ لگتی ہوں لیکن اب اچھی نہیں تو بری بھی نہیں لگتی ہوں۔" اس کے دل و دماغ یک زبان کہہ رہے تھے اور خولہ کی بات سے بگڑا مزاج ٹھیک ہونے لگا۔ خولہ کے بجائے اپنے دل دماغ کی سننا عقل مندی تھی۔

وہ بڑی امی سے کام کی کوئی بات کرنے باہر جا رہی تھی کہ پورچ سے آتی ودیع کی آواز پر رک گئی۔ اس کی دانست میں اس کی امی اور بڑی امی وہاں بیٹھی تھیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہے امی۔"

"تو بیٹا! اب اپنے ابا سے بات کرلو۔ سب نے بہت صبر کیا ہے۔ طلال اور منیرہ نے کبھی دباؤ نہیں ڈالا، تقاضا نہیں کیا لیکن ہم مزید ان کا صبر نہیں آزما سکتے، یہ زیادتی ہوگی۔ ایسا نہیں ہے کہ انہیں پروا نہیں تھی، وہ بھی بہت فکرمند تھے، لوگوں کے سوالوں کا سامنا انہیں بھی کرنا پڑتا تھا مگر اس گھر کے حالات وہ سمجھتے ہیں پھر طوبیٰ نے بھی شاید انہیں روک رکھا ہوگا کہ وہ ایسا ذکر سے اپنے بڑے ابا کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم وہیں نوکری کرنا چاہتے ہو، کرو مگر اب اسے ساتھ لے جاؤ بیٹا، اپنا سنسار شروع کرو، تمہیں بھی اب خود کو ان آسودگیوں سے دور نہیں رکھنا چاہیے۔"

وہ دم سادھے ودیع کی آواز کی منتظر تھی کہ گیٹ کے باہر بجے ہارن نے اسے موقع نہیں دیا۔ ودیع اٹھ کے گیٹ کھولنے چلا گیا اور وہ گہرا سانس بھرتی واپس آگئی۔

کمرے میں آکر وہ بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا کہ ودیع کو سچ بتا دے یا اس سچائی کے بنا ہی اسے فیصلہ کرنے دے۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانے نہیں آیا اور اس ادراک نے اس کے اندر اپنی خطا کے احساس کو بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

نو سال پہلے کا وہ فیصلہ کن دن وہ کیسے بھول سکتی تھی جس نے ان سب کی زندگیوں کا رخ موڑ دیا تھا۔ وہ بڑے ابا سے بحث کے بعد اپنی فائلیں اور فولڈرز لیے جانے کس کام سے باہر گیا تھا۔ گھر میں قبرستان جیسا سناٹا اور وحشت پھیلی تھی۔ اس سے قبل

URDU NOVELS MAG
CS CamScanner

ایسی جرأت کسی نے نہیں کی تھی۔
"اب کیا ہوگا؟" بہت دیر وہ بھی سہمی سی اپنے کمرے میں دبکی سوچتی رہی پھر دبے پاؤں باہر نکلی تاکہ ودیع کو اپنی طرف سے سمجھانے، قائل کرنے کی کوشش کرے۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ مایوس سی باہر آگئی کہ زینے پر بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرے گی۔

"کہاں چلے گئے؟ کب تک آؤ گے؟" اس نے اسے پیغام بھیجا۔

زینے کے پاس پہنچی تو نیچے پڑی بلیو رنگ کی چیز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ اسے اٹھا کر سیدھی ہوئی ہی تھی کہ آہٹ پر مڑی، بڑے ابا نے بھی اس کے ہاتھ میں پاسپورٹ دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور طوبیٰ نے انہیں تھما دیا۔ انہوں نے کھول کر دیکھا اور اندر چلے گئے حالاں کہ انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا وہ گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔

"یہ غصے اور عجلت میں گھر سے نکلتے ہوئے شاید ودیع کے فولڈر سے گرا ہوگا۔"

اس نے سوچا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی واپسی کے انتظار میں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا لیکن وہ نہیں آیا۔ آخر بڑی امی اور امی کی آوازوں پر اسے اٹھ کر اندر جانا پڑا۔

جانے وہ کب واپس لوٹا تھا اور اسے پاسپورٹ کی خبر کب ہوئی تھی لیکن رات میں بڑے ابا نے جو کہا، وہ سن کر تو اس کے سر پر آسمان گرا تھا۔

"پاسپورٹ چاہیے ہو تو جانے سے پہلے طوبیٰ سے نکاح کرلو۔"

ہر کوئی اس انوکھی بات پر سکتے میں تھا۔ گھر میں طلال اور ودیع کے لیے لڑکیاں دیکھنے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں حالاں کہ وہ دونوں "تین چار سال تک شادی کا ارادہ نہیں" کہہ چکے تھے۔ اسے اپنی امی اور بڑی امی کی خواہش کی بھنک بھی تھی، یہ ہی اس کے دل کی تمنا بھی لیکن یہ اس طرح منوایا جائے۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی

بڑے ابا کا جملہ ختم ہوتے ہی ودیع نے اس قدر حیرت، بے یقینی اور جلال سے اسے دیکھا تھا کہ اس کی ہستی وہیں ڈھے گئی۔ ایک ذرا سی آس جو تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔

اسے اپنے بارے میں کوئی خوش گمانی نہیں تھی۔ گوری چٹی شکلوں والے خاندان کی وہ واحد سانولی لڑکی تھی۔ نقوش عام سے ہوں تو گوری رنگت پر اسے بھی حسینوں میں شمار کرلیا جاتا ہے پر یہاں تو صورت بھی عام سی تھی اور رنگت بھی۔ بڑی امی، امی، خولہ اور ناہید بھابھی سب ہی اجلی گلابی جلد کی مالک تھیں۔ ایسے میں ودیع کا اسے اس حیثیت سے ناپسند کرنا بڑی عام سی اور ممکن بات تھی۔

ایک دن بعد کی اس کی ٹکٹ تھی۔ وہ یہاں نوکری سے استعفیٰ دے کر بیرون ملک میں تین سال کا معاہدہ قبول کرچکا تھا۔ اس نے بالا ہی بالا سب کچھ طے کرکے آخری وقت گھر میں اطلاع دی تھی پھر بھی بڑے ابا نے اس کے لیے کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔

آخر پاسپورٹ کی بازیابی کے لیے اس نے سب کے سامنے اسے بطور منکوحہ قبول کرلیا اور وہ ٹوٹ پھوٹ گئی۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا پچھتاوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ آزاد ہونا چاہتا تھا اور اس نے اسے پچھلی قید سے بڑی جیل میں ڈال دیا تھا۔

"کاش وہ پاسپورٹ نہ اٹھاتی، اٹھالیا تو چھپا لیتی بڑے ابا کو نہ دیتی!"

وہ کتنے دن دل تھامے انتظار میں رہی کہ اب اس نے طلاق بھیجی کہ جب بھیجی لیکن جب مہینوں گزر گئے تو اسے یقین ہوگیا کہ بڑی امی نے اسے کوئی قسم دے کر روک رکھا ہے اور وہ مزید ملال میں گھر گئی کہ اس کے ساتھ ہر کوئی جبر اور زبردستی ہی کر رہا تھا۔

خولہ بھابھی الگ اسے بار بار احساس دلاتی رہتیں کہ بے چارے کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔

عام حالات میں اس بے جوڑ رشتے پر وہ کبھی مان ہی نہیں سکتا تھا۔

الٹے سیدھے دلائل اور نئے نئے نکتے اٹھا کر، خوف دلا کر اس نے امی اور بڑی امی کو روکے رکھا تھا کہ اس کی شادی، رخصتی کو لے کر ودیع پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے نہ تقاضا کیا جائے۔

لیکن بڑی امی کچھ وقت ہی اس کی بات مان سکیں۔ وہ اور ثاقب بھائی ہی تھے جو اس سے طوبیٰ کو ساتھ لے جانے کا کہتے تھے، اس سے اس موضوع پر بات کرتے تھے۔ وہ ہر بار 'ہاں آؤں گا' اتنا کہتا تھا اور انہیں یہ ہی اطمینان ہوجاتا کہ کم سے کم وہ یہ رشتہ ختم کرنے کی بات نہیں کرتا ہے۔ جس ثابت قدمی سے وہ باہر رہ رہا تھا، اس بات نے بھی ان سب کو محتاط کردیا تھا۔ سب کے دلوں میں ڈر تھا کہ اسے مزید کوئی ضد نہ دلائی جائے۔ دوسرے وقت کے ساتھ ذمہ داریاں بڑھیں تو دونوں بھائی مصروف بھی زیادہ ہوگئے تھے۔ خود اپنے بچوں میں الجھ کے رہ گئے تھے۔

بڑے ابا کو یقین تھا، وہ سال دو سال یا اپنا معاہدہ ختم ہونے پر تو واپس آہی جائے گا، تاہم گزرے وقت نے انہیں اس کی ضد کا احساس کرایا۔

ان کی مان کر وہ انہیں ہی سزا دے گیا تھا، اس انکشاف نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا۔

طوبیٰ کی زندگی کی ویرانی بھی ان کی وجہ سے تھی، اس پر وہ صابر بچی نہ آہ کرتی تھی نہ اف۔ اس کی تابع داری اور محبت نے انہیں اور جھکا دیا۔ انہوں نے تو یہ سوچا تھا کہ نکاح کرکے وہ اس کی واپسی یقینی بنا رہے ہیں۔ ان کی شرط نے دو زندگیاں ویران کر دی تھیں، یہ احساس جرم انہیں سرتاپا بدل گیا تھا۔ انہوں نے ثاقب اور شہاب کے بچوں کے معاملات سے خود کو بالکل الگ کرلیا تھا۔

"کیا میں نے زندگی میں بچوں پر صرف ظلم اور سختیاں ہی کی ہیں؟ میں نے ان کے لیے کوئی اچھا کام نہیں کیا؟"

راتوں کو نیند نہیں آتی تو وہ بیوی سے پوچھتے اور وہ اٹھ کے بیٹھ جاتیں۔

"آپ نے وہ سب کیا ہے، جس کی وجہ سے آج آپ کے بچے خود مختار اور کام یاب ہیں، معاشرے میں مقام اور عزت رکھتے ہیں۔ آج نہیں تو کل بچے بھی سمجھ جائیں گے۔ آپ ایسا نہ سوچا کریں،" وہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتیں اور وہ افسردگی سے مسکرا دیتے کہ وہ انہیں بہلا رہی ہیں۔

☆☆☆

وہ کمرے سے باہر نکلی تو فیصلہ کرچکی تھی۔

دستک سن کر ودیع نے اندر آنے کی اجازت دینے کے بجائے اٹھ کے دروازہ کھولا اور سامنے طوبیٰ کو دیکھ کر واقعی حیران ہوا۔

"مجھے کچھ بات کرنی ہے، اندر آجاؤں؟"

اس کا سوال اس کی یہاں موجودگی سے زیادہ اچنبھے والا تھا۔

اس نے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ وہ دروازہ بند کرکے پلٹا تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑی سراپا اضطراب اور انتظار تھی۔

"ودیع!" اس نے خود کو وقت نہیں دیا مبادا ارادہ بدل ہی نہ جائے اور بنا کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"اس دن تمہارا پاسپورٹ مجھے زینے پر پڑا ملا تھا اور میں نے ہی وہ بڑے ابا کو دیا تھا۔ اگر اس وقت میں نے تمہیں وہ واپس کردیا ہوتا، کہیں چھپا دیا ہوتا یا بڑے ابا کے مانگنے پر انہیں انکار کردیتی تو وہ سب نہ ہوتا۔ بڑے ابا تمہیں نکاح کے لیے مجبور نہ کرتے اور نہ تمہیں اتنے سال پردیس میں گزارنا پڑتے۔

مجھے اس وقت بھی اس بات کا بہت افسوس اور دکھ تھا، آج بھی ہے کہ تمہیں اپنا خواب پورا کرنے کے لیے اس طرح بلیک میل ہونا پڑا، تمہیں زبردستی ایک ان چاہے اور ناپسندیدہ رشتے میں بندھنا پڑا اور پھر اس سے بچنے کے لیے تمہیں سب سے دور رہنا پڑا

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

اور اب پھر تمہیں ہر کوئی پریشرائز اور بلیک میل کر رہا ہے۔ ان سب کی وجہ میں ہوں، نہ میں وہ پاسپورٹ بڑے ابا کو دیتی نہ۔''

جس تیزی سے وہ بول رہی تھی اسی رفتار سے اس کے آنسو بھی گر رہے تھے۔ پاسپورٹ والی بات اس کے لیے نئی ضرور تھی لیکن اب وہ بات اہم نہیں رہی تھی۔

''طوبیٰ!'' اس نے پاس آ کر اسے شانوں سے تھام کر روکا۔

''ان سب کی ذمہ دار تم نہیں ہوئے'' وہ اور تیزی سے رونے لگی۔

''تم غصہ کرو گے، مجھے برا بھلا کہو گے تو مجھے برا نہیں لگے گا۔'' اس نے گردن ہلکی سی خم کر کے التجائیہ انداز میں کہا اور روتے ہوئے مسکرائی۔

''مجھے کبھی تم پر غصہ نہیں آیا طوبیٰ۔'' اس نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے ہلکے سے جھنجوڑا۔ ''تم اتنے وقت سے یہ سب سوچتی رہی ہو؟''

اس کی آواز تاسف سے لبریز تھی۔

''میں تم سے یا اس رشتے سے بچنے کے لیے سب سے دور نہیں تھا۔'' اس نے ایک ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے آنسو صاف کیے۔

''پھر نو سال تک تم آئے کیوں نہیں ودیع؟'' اس نے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جاننے کے لیے تمہیں پہلے مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ میں کیا سوچ کر گیا تھا؟'' اس نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے شانے سے ہٹایا اور تھوڑا پیچھے ہو کر گہری سانس لی۔

''تم کیا سوچ کر گئے تھے ودیع؟'' طوبیٰ نے پہلے سوال کے انداز میں ہی پوچھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، میں کیوں گیا تھا؟''

''تمہیں تو ہر حال میں جانا تھا جس کے لیے تم نے بڑے ابا کی شرط بھی منظور کر لی تھی، تمہارا خواب، تمہاری خواہش باہر جانا تھی، وہ پوری ہو گئی تو۔''

''نہیں طوبیٰ! [illegible] کے آگے آیا۔ ''میری خواہش، میرا خواب تم تھیں جسے ابا نے مجھ سے چھین لیا تھا۔'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''ابا مجھے جانے دیتے، کچھ وقت بعد مجھے واپس آ ہی جانا تھا لیکن وہ کیسے مجھے میری پسند اور مرضی سے کچھ کرنے دے سکتے تھے؟ انہوں نے ساری عمر ہمیں غلاموں کی طرح اپنی مرضی پر نچایا، انہیں ہماری ڈور ہلانے اور ہمیں اسی کے مطابق حرکت کرتے دیکھنے کی عادت تھی، ان کے مطابق ہماری زندگیوں پر اختیار صرف ان کا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا یا انجانے میں کہ میری خوشی، میری خواہش کو انہوں نے اپنی ضد بنا لیا، انہوں نے مجھے اپنی مرضی کرنے کی سزا دیے، اپنے آگے جھکانے کے لیے تمہیں استعمال کیا تھا۔ میں نکاح سے انکار کر کے باہر نہ جاتا تو وہ جیت جاتے اور نکاح کر کے باہر جاتا تو بھی ان کی شرط مان کر انہیں جتا دیتا، ہر حال میں جیت ان کی تھی اور یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ میں انہیں شکست دینا چاہتا تھا ایسی کہ سارے بدلے پورے ہو جاتے، میں انہیں دکھانا، جتانا چاہتا تھا کہ وہ ہر بار اپنی مرضی نہیں چلا سکتے، ہر بار انہیں ان کی پسند کے نتائج نہیں مل سکتے، ان کی ساری جوڑ توڑ ناکام بھی ہو سکتی ہے، ان کی حکم عدولی بھی ہو سکتی ہے، ان کے منصوبے فیل بھی ہو سکتے ہیں، جبر کا انجام ساری عمر کا پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے اور۔۔۔''

''اور میں ودیع، میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟ بڑے ابا کی چہیتی ہونے کی سزا مجھے بھی ملنی چاہیے، مجھے بھی ان کی بات مان لینے پر زندہ در گور ہو جانا چاہیے؟'' ودیع کو مخاطب کرتے ہوئے پہلی دفعہ اس کا لہجہ ٹوٹا بکھرا سا تھا۔

''نہیں طوبیٰ!'' وہ اس کے اتنے قریب آیا کہ ایک قدم کا فاصلہ بھی نہیں رہا۔

''میں خود کو سولی پر لٹکائے بنا انہیں ہرا نہیں سکتا تھا۔ انہیں غلطیوں کا احساس ہو، اس لیے ضروری تھا کہ میں یہ دکھ، یہ ہجر سہتا اور،''

''اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو میرا احساس کیوں نہیں کیا۔؟ کیا یہ دکھ تمہارا اکیلے کا تھا؟ سولی پر صرف تم لٹکے تھے؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا، مجھے اس سزا میں شامل ہونا بھی ہے یا نہیں، میں یہ دکھ اٹھانا چاہتی بھی ہوں یا نہیں، مجھے اتنے سالوں کی دوری منظور ہے یا نہیں؟''

وہ بری طرح رونے لگی اور ودیع کو یقین نہیں آیا، ایسی حیرانی تھی کہ پل بھر کو اس سے گویائی ہی چھن گئی۔

''تم خود کو سزا دے رہے تھے، بڑے ابا کو شکست اور میں۔۔۔؟ میری حیثیت، میری فیلنگز، میری مرضی،'' ودیع نے خود پر قابو پا کر اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے۔

''سوری طوبیٰ۔'' ہاتھ اوپر اٹھا کر اس نے سر جھکا کر ان پر ماتھا ٹکایا۔ اس کے انداز میں ندامت اور تڑپ تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا اس پروسس میں، میں تمہیں اتنا ہرٹ کر رہا ہوں۔'' اسے واقعی اس انکشاف نے ہلا دیا تھا۔

دونوں کے مفروضے غلط تھے لیکن المیہ یہ تھا کہ اس بات پر اس لمحہ خوش کوئی نہیں تھا۔

''میں نے صرف اپنے لیے یہ سزا چنی تھی، میں یہاں آنے سے اس لیے ڈرتا تھا کہ تم مجھ سے اپنی بات منوا کر یہ رشتہ ختم کرنے کا نہ کہہ دو یا ابا ہی میری حرکت پر مجھے تم سے الگ ہونے کا حکم نہ صادر کر دیں اور تم اپنے بڑے ابا کی بات ایک بار پھر مان جاؤ۔''

''تم پاگل ہو ودیع؟ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ تم ایک لڑکی سے نکاح کر کے اسے نو سال تک پلٹ کر نہ دیکھو اور سوچو کہ یہ صرف تمہارے لیے سزا ہے، ایسا کیسے کر سکتے ہو تم، وہ بھی اس وقت جب تمہیں اس لڑکی سے محبت کا دعوا بھی ہے؟''

اس نے ودیع کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر اس کے سینے پر مارا۔ ودیع نے اسے سنبھالنے سمیٹنے کی کوشش کی لیکن طوبیٰ زخمی اور بپھری تھی۔ اس سے یہ اعتراف، یہ اظہار سنبھل نہیں رہا تھا۔ اسے اب تک اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا یہ جان کر آیا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار اس سے دور تھا۔ اسے اب اپنے اتنے سالوں کے غم اور پچھتاوے کا غصہ بھی اس پر آ رہا تھا۔

''تم سے بڑا بے وقوف اور خود غرض اس دنیا میں نہیں ہو گا۔'' اس نے پوری قوت لگا کے خود کو اس سے دور کیا۔

''میں اب تک یہ ہی سوچتی رہی کہ تمہیں میں پسند نہیں تھی اور بڑے ابا نے زبردستی تمہارے ساتھ باندھ دیا، اس بات پر تم ناراض ہو اور اس بات پر تمہارا نہ آنا مجھے قبول بھی تھا لیکن تم مجھ سے محبت کے باوجود، مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کے باوجود محض اپنی ضد اور انا کی خاطر نو برس گنوا کے آئے ہو، وہ بھی اپنے بوڑھے، بیمار اور پیار کرنے والے باپ کو سبق سکھانے، سزا دینے اور اب چاہتے ہو میں تمہاری محبت کا یقین کر لوں،'' اس نے دریا بنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''کاش تم نہ آتے ودیع! تم جاؤ واپس اور اب کبھی مت آنا۔'' وہ جانے لگی۔

''طوبیٰ!'' اس نے سامنے آ کر راستہ روکا۔

''ایم ریئلی سوری۔ تم میری بات تو سنو،'' وہ اس کے پاس سے نکل کر جانے لگی تھی کہ اس نے بازو پکڑ کر روکا۔

''سب کچھ تو سن لیا اور کیا رہ گیا ہے سننے کے لیے؟'' اس نے بازو چھڑایا۔

''مجھے تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنی، یہی سمجھو تم کہ میں نے تمہیں اسی لیے بلایا تھا تا کہ یہ رشتہ ختم کر سکوں، ختم کر دیا۔ اب جاؤ۔'' اس نے ودیع کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''میں گھر میں سب سے بات کر لوں گی۔ تم اپنی ریٹرن ٹکٹ بک کروا لو۔'' وہ تیزی سے باہر نکلی اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا۔

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com

ودیع کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ہنسے، روئے، اس کے پیچھے جا کر اسے منائے یا یہیں بیٹھ کر ماتم کرے۔

☆☆☆

صبح وہ دیر سے جاگی اور اس کے بعد بھی سستی سے بستر پر پڑی رہی۔ جب باہر کا شور کم ہوا اور چائے کی طلب نے ناراض ہو کے دھپ دھپ کرتے ہوئے سر کا رخ کیا تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آئی۔

وہ جو شور کم ہونے پر سمجھ رہی تھی، سب ناشتے سے فارغ ہو کر کام کاج پر نکل گئے ہیں اور بقیہ کمروں میں بند ہیں، بڑے ابا کے کمرے کا کھلا دروازہ اور اندر ٹھونس کر بھرے سارے افراد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

چائے بناتے ہوئے اس اجتماع پر غور کرتے ہوئے خیال آیا کہ کہیں بڑے ابا کی طبیعت نہ بگڑ گئی ہو اور وہ تیزی سے بھاگنے کے ارادے سے پلٹی ہی تھی کہ خولہ سے ٹکرا گئی۔

"توبہ!" انہوں نے سر سہلایا۔ "کہاں جانے کی جلدی ہے اب تمہیں؟"

"وہ بڑے ابا۔" دل تو کر رہا تھا انہیں ہاتھ سے ایک طرف دھکا دے کر بھاگے لیکن خولہ کے ساتھ تحمل کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"ہاں بڑے ابا ہی پلان بنا رہے ہیں سارے اب بھی، آخر تمہاری اور اس گھر کی۔ مطلب ان کی اولاد کی آخری شادی ہے۔" وہ فوراً اپنے تاثرات چھپانے کے لیے پلٹ کر چائے کپ میں نکالنے لگی۔ اس کا پارہ ایک دم آسمان چھو گیا تھا۔

"ویسے امید نہیں تھی مجھے ودیع خود سے بات کرے گا اور بڑے ابا بلا چوں چرا ں مان جائیں گے۔ ذرا باقی سب کی بھی چائے بنا لو، میں تب تک۔"

"آپ خود بنا لیں، میرے سر میں درد ہے۔" اس کا دماغ ایسے [illegible] وہ ان سے روا رکھا جانے والا تحمل، عادت سب بھول کر ہکا بکا کھڑی خولہ کو دیکھے بنا اپنا کپ لیے کمرے میں آگئی۔

اس چالاکی نے اسے مزید بھڑکا دیا تھا۔ غصے نے واقعی اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی تھی، ذہن ماؤف تھا۔ وہ بس بے انتہا غصے میں تھی اور بہت کچھ کرنے کی خواہش میں پاگل ہو رہی تھی۔ ذرا دیر بعد خیال آیا کہ مجلس برخاست ہوتے ہی امی اور بڑی امی ادھر آئیں گی تو وہ سنبھل گئی۔ جا کے منہ دھویا، حلیہ درست کیا اور آئینے کے سامنے آئی تو چہرہ دیکھتے ہی ودیع کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔

"میری خواہش، میرا خواب تم تھیں!"

"اونہہ!" اس نے سر جھٹکا۔ "نو سال۔" وہ اس بے وقوفی، اس ظلم کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

"بڑے ابا نے ودیع کو اتنی نفرت تھی۔" کہیں سے اڑتا اڑتا آیا خیال ذہن پر سایہ فگن ہو گیا۔

"محبت اتنی کمزور اور نفرت اتنی طاقت ور۔" وہ آئینے میں خود کے عکس سے باتیں کرنے لگی۔

"نہیں نفرت تو نہیں۔ یہ ضد تھی۔ ضد اور بڑے ابا کو غلط ثابت کرنے کا جنون۔"

"لیکن بڑے ابا یہ تو ڈیزرو نہیں کرتے۔" افسوس پھر غصے میں ڈھل گیا۔

"اس نالائق نے کیوں نہیں سمجھا!"

☆☆☆

عین توقع کے مطابق ذرا دیر بعد امی اس کے کمرے میں آئیں۔

اگلے اتوار کو تقریب تھی اور اس کے بعد ودیع کے ساتھ اس کی روانگی۔ ان کے پیچھے بڑی امی بھی چلی آئیں اور وہ سعادت مند و مثالی بیٹی کی طرح غصے سے جھکے سر کو شرم سے جھکا سر جتاتی ان کی سنتی رہی۔

اسے شرم کے پیچھے چھپ کے سارا دن کمرے میں بند رہنے کا بہانا مل گیا تھا۔ اگلے دن صبح ہی صبح اسے پتا چلا ان دونوں کا اپائنٹمنٹ ہے میرج رجسٹریشن کے سلسلے میں جو اس کے ویزا کی درخواست کے لیے اہم اور ضروری تھا۔ ساتھ ہی

اسے بتایا گیا کہ جلد ہی اسے ویزا کے لیے ودیع کے ساتھ ایمبیسی بھی جانا ہے اور وہ تلملا کے رہ گئی۔

"کیا ثاقب بھائی، بڑی امی یا امی نے ودیع کے ساتھ پہلے ہی سب طے کر لیا تھا؟" یہ سب راتوں رات تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے جانے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ جو ودیع سے کہہ دیا تھا اور اس پر جتنا بھی غصہ تھا، وہ یہ گھر میں کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ عبایا پہننے سے پہلے سوچا کہ بڑے ابا کی دوپہر کی دوائیاں نکال کر رکھ آئے۔ ادھ کھلے دروازے کو ہاتھ بڑھا کے پورا کھولتی اس سے قبل ثاقب بھائی کی آواز پر رک گئی۔

"ڈیپنڈنٹ ویزا اتنی جلدی شاید نہ ملے اس لیے اس وقت ٹورسٹ ویزا پر ہی جائے گی۔"

"اچھا۔" بڑے ابا کی نحیف سی آواز سوچ کے وزن سے بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"ودیع بیٹا! تمہاری مجھ سے جو ناراضی اور غصہ ہے اسے طوبیٰ پر۔۔۔"

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں ابا نہ مجھے کسی پر غصہ ہے۔" اس نے یہ مشکل بات بمشکل کہہ ڈالی۔

"ابا!" ثاقب بھائی نے ودیع کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔

"آپ کا سخت مزاج کبھی ہمیں گراں گزرتا تھا اس وقت ہمیں اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن اب غصہ ناراضی جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ ودیع نے اتنا وقت کیوں لگایا، پہلے کیوں نہیں آیا، ان سب پر اب بات کریں نہ ہی غور تو بہتر ہوگا۔"

اولاد کو والدین کی بے غرض محبت اور نیت کا یقین آجائے تو پھر پہاڑ جیسے شکوے شکایتیں بھی پس پشت پر چلے جاتے ہیں اور ثاقب بھائی اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں ان کے پاس یہ یقین تھا۔

"ابا!" وہ ثاقب بھائی کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا کر ان کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے تین سال کے کانٹریکٹ کے بعد واپس آنے والا تھا اور اس وقت آپ مجھے طوبیٰ سے شادی کا کہتے تو میں خوشی خوشی مان جاتا کہ طوبیٰ مجھے اس وقت بھی پسند تھی لیکن اس وقت شادی کی شرط مجھے ضد دلا گئی تھی۔ آئی نو میں نے غلط سمجھا اور اس کے بعد بھی غلط کیا لیکن اب میں سب ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے لگنے لگا تھا کہ ابا کو بھی احساس ہے کہ ان کا رویہ غلط اور ضرورت سے زیادہ سخت تھا جس نے بچوں پر برا اثر ڈالا اور اب وہ یہ ہی بات جتا کر انہیں شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے ان کے کمزور سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"آپ میری ساری بدتمیزیوں، نادانیوں اور بے وقوفیوں کے لیے مجھے معاف کر دیں۔" ان کا طنطنہ اور ان کی حکومت کو سرنگوں دیکھنے کی شدید خواہش کے ہوتے ہوئے بھی اسے بیمار اور لاغر باپ کو دیکھ کر رتی برابر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بڑے ابا نے ڈبڈبائی آنکھوں کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جیتے رہو بیٹا۔" وہ مزید کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہ واپس کمرے میں آگئی۔ جانے انہوں نے کیا کہا ہوگا لیکن وہ اپنے بڑے ابا کو بچوں سے معافی مانگتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے بہت رونا آرہا تھا۔ یہ سب بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا، یہ دوریاں کب کی سمٹ جاتیں اگر وہ پہلے آجاتا۔

"اگر تم پہلے میسج کر دیتیں!" اندر سے آواز آئی۔

وہ ثاقب بھائی کے ساتھ ان کی کار میں رجسٹرار کے دفتر آئے تھے۔

وہاں سے واپسی پر جب وہ ودیع کے ساتھ باہر آئی تو ثاقب بھائی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ معاملہ سمجھتے ہی اس نے دائیں طرف سے آرہے رکشا کو روکنے کے لیے آگے جا کر ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ودیع نے پیچھے سے لپک کر اس کا ہاتھ نیچے کیا۔

"ثاقب بھائی کسی کام سے گئے ہیں، تب تک ہم بات کر لیں۔" وہ جتاتے ہوئے مسکرایا۔

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جو یہاں ہو سکتی ہے مگر گھر میں نہیں، دوسرے مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا سننا۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"میرج رجسٹرار کے آفس کے باہر کھڑے ہم لڑ رہے ہیں اور تمہیں پتا ہے، دو انسانوں کے میرڈ ہونے کا ثبوت لڑائی سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔"

وہ لب بھینچے چپ رہی۔

"مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تمہیں کہاں کے سموسے اچھے لگتے ہیں۔" کچھ دیر اس کے تنے سے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد ودیع نے افسوس سے کہا۔

"نکیں کے پسند بھی ہوتے تو میں نہ ان کے لیے جان دے سکتی ہوں نہ کچھ مان سکتی ہوں۔" اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہی اس نے تنک کر کہا۔

"جان تو تمہاری مجھے بھی عزیز ہے، بس مانو گی کیسے یہ بتا دو۔" وہ قریب ہوا اور وہ دور۔

"تم کسی خوش فہمی میں مت رہو، میں صرف بڑے ابا کی وجہ سے چپ ہوں اور تمہاری یہ حرکتیں میرے غصے کو مزید ہوا دے رہی ہیں۔"

"شکریہ۔" اس نے احترام سے سر خم کیا۔ بس کون سی حرکتیں غصہ دلا رہی ہیں، ان کی نشان دہی کر دو۔"

"یہ جو تم فضول ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو وہ اور یاد رکھو، زبانی محبت کے دعوے مجھے امپریس نہیں کرتے، خود کو اس زعم سے باہر نکالو، نو سال سے تم جو کر رہے تھے، وہ محبت ہرگز نہیں تھی، رکشا!" اس نے بروقت آواز دی تھی۔ رکشا اس کے سامنے آن رکا۔ اندر بیٹھتے ہی اس نے۔ 'چلو بھیا' کہا تو وہ ہوش میں آ کر رکشا میں سوار ہوا ورنہ طوبیٰ کا ارادہ اسے چھوڑ کر نکل جانے کا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور نے میٹر گراتے ہوئے پوچھا۔ طوبیٰ نے محلے کا نام بتایا۔

"ذرا لمبے راستے سے لے چلنا بھیا۔" ودیع نے مسکین سی صورت بنا کے التجا کی۔ ڈرائیور کی بتیسی باہر ابل پڑی۔ سخت تاثرات کے ساتھ بے نیازی سے باہر دیکھتی لڑکی اور گاہے گاہے اس پر نگاہ ڈالتا مسکین سا لڑکا۔

"دیکھیں بھیا! جہاں لو ہوتا ہے وہیں لڑائی بھی۔" ڈرائیور کی معلومات کے مطابق اس جگہ سے رکشا میں سوار ہونے والے جوڑے کورٹ میرج کیسز ہی ہوتے تھے سو اس نے اپنی دانست میں شغل شروع کیا۔

"لیکن بھابھی! پہلے ہی دن آپ کو تھوڑی تو رعایت کرنا چاہیے۔"

"سائیڈ میں روکو رکشا ابھی۔" طوبیٰ نے پرس کا گرتا اسٹریپ شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ تو۔" وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔

"روکو۔" اب کے اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس نے رفتار کم کرتے ہوئے رکشا سڑک کے کنارے لگا دیا۔

"سوری۔" اس کے پیچھے ڈرائیور کو پیسے پکڑاتے ہوئے ودیع نے کہا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ڈرائیور کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ ودیع اس کے پیچھے لپکا جو اوبر بک کرنے کے لیے فون میں ایپ کھول رہی تھی۔

"طوبیٰ!" اس نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"تم ابھی میرے ساتھ میرج رجسٹر کر کے آئی ہو اور مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"تم نے سب کو اتنی کڑی اور لمبی سزا دی ہے کہ اب میرے پاس اپنے کسی فیصلے سے انہیں پھر دکھی کرنے کا اختیار بھی نہیں رہا۔" طوبیٰ نے اتنی ہی بے رخی سے جواب دیا۔

"مجھے اس کا افسوس ہے، میں شرمندہ ہوں، اپنی غلطیاں سدھارنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے موقع دو۔"

"موقع کیوں۔ تمہیں اپنی خطاؤں کا بدلہ نہیں چاہیے، جیسا تم بڑے ابا سے لینا چاہتے تھے؟"

"میں نے کب روکا، تم بدلہ ہی لے لو۔"

"تو پھر اگلے نو برس تم میری ضد بھگتو۔"

"یار!" وہ کراہا۔ "میں جان اور مان گیا ہوں ضد بہت بری چیز ہے اور تم اتنی ظالم نہیں ہو، میرے توبال بھی سف۔"

وہ ایک دم رک گیا۔

وہ جو کہنے جا رہا تھا۔ وہ اسے اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب نو سال آہستہ آہستہ سرک کر زندگی مختصر کر رہے تھے۔ وہ خود ساختہ ہجر ختم ہونے کے بعد زیادہ تکلیف دہ تھا۔ طوبیٰ کی آنکھیں بھر آئیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے چہرہ ایک طرف کر لیا۔ وہ فون، جیب میں ڈالتا آگے آیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

"کیا ضروری ہے، میرے جیسی نادانی تم بھی کرو؟ نو سال کی تلافی کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور جانتی ہو، تمہاری ناراضی ہمارا کتنا قیمتی وقت چھین رہی ہے؟"

"یعنی قصور اب بھی تمہارا نہیں ہے!" اس نے روتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"سارے قصور، ساری غلطیاں میری ہیں، بس تم مان جاؤ اور مجھے معاف کر دو، پلیز۔"

تب ہی قریب سے ابھرے تیز ہارن پر دونوں ہڑبڑا گئے۔ ثاقب بھائی گاڑی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ سرخ ہو گئی۔

"یقیناً نو سال لمبا وقت ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"لیکن ہاتھی نکل گیا ہے تو دم کے لیے کیوں بے صبرے ہو رہے ہو؟" گھر میں تو سب کے ہی مزاج شوخ ہو رہے تھے۔

"بے صبری کا طعنہ تو زندگی بھر مجھے کوئی نہیں دے سکتا۔" اس نے فخریہ انداز میں گردن اکڑائی۔

"بس تھوڑی پرائیویسی درکار ہے جو گھر میں میسر نہیں۔" اس نے طوبیٰ کا ہاتھ پکڑا۔

"اس لیے آپ جائیں گھر، ہم پہنچ جائیں گے، کیوں طوبیٰ؟" اس نے اسے دیکھ کر تائید چاہی۔

اسے غصے کے اظہار میں ہاتھ چھڑا کے ثاقب بھائی کی کار میں بیٹھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ ہاتھ چھڑا نہیں پائی اور سر جھکا دیا۔

ثاقب بھائی نے ہنستے ہوئے گاڑی گھر کی سمت موڑ دی اور وہ اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔

"روایت تو منہ میٹھا کرنے والی ہے مگر موقع 'شرماجی' کے سموسوں کی ٹریٹ کا ہے۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں مان گئی ہوں۔" اس نے ساتھ چلتے ہوئے جتایا۔

"میں نے نوٹ کر لیا کہ تم مانی نہیں ہو۔" اس نے چلتے چلتے اپنا وہ ہاتھ اونچا کیا جس میں اس کا ہاتھ جکڑ رکھا تھا۔

"یہ اس لیے کہ نو سال بعد تم کہیں راستہ نہ بھٹک جاؤ۔" اس نے آنکھ سے ہاتھ کی سمت اشارہ کیا۔

"احتیاطاً دوسرا ہاتھ بھی دے دو۔" وہ رک کر اس کے سامنے آیا۔

"یہ لندن نہیں ہے جہاں راستوں پر رومانس ہوتا ہے۔" آس پاس سے گزرنے والے انہیں گھورے جا رہے تھے۔

"تمہارا مطلب ہے یہ رومانس ہو رہا ہے؟ نہیں رکو۔ مطلب تمہاری رومینٹک ایکسپیکٹیشن بس اتنی ہے؟" اس نے ایک بار پھر اپنی گرفت میں دبا اس کا ہاتھ اونچا کیا۔

"تم نے تو نو سال میں بڑی ترقی کر لی ہے!" اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے چبا چبا کے کہا۔

"کوئی بات نہیں، تمہیں نو دن میں سکھا دوں گا۔" اس نے شرارت سے ایک آنکھ دبائی اور وہ ہاتھ چھڑا کے آگے بڑھ گئی۔ ودیع ہنستے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ اب یہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلنے، بھاگنے، لپکنے اور پھر قدم ملانے کی مشقت عمر بھر کی تھی۔

☆☆

URDU NOVELS MAG
www.urdunovelsmag.com
CamScanner